گل قریش
میرے ساحر سے کچھ کہو
شازیہ چوہدری
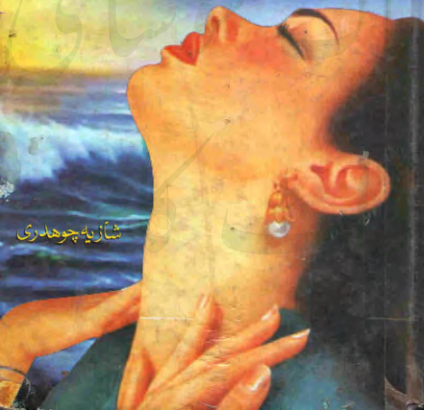
پیش لفظ

سب سے پہلے میں محترم جناب مبین خٹک کی انتہائی مشکور ہوں کہ اُنہوں نے میرے زیرِ نظر ناول ''میرے ساحر سے کچھ کہو'' کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ میں نے مبین بھائی کو دوسرے پبلشرروں سے مختلف پایا۔ یہ ناول کو شائع کرنے کے صحیح ہنر سے صحیح طور پر واقف ہیں۔ ان کے ہاں سے کتابی شکل میں شائع شدہ ناولز کو میں نے دیکھا ہے۔ جہاں اُن کی کتاب پر کی گئی محنت نظر آتی ہے۔ اور میں اُمید کرتی ہوں۔ اگر میرے رب نے چاہا تو انشاء اللہ مستقبل میں لکھی جانے والی تحریروں کو کتابی شکل میں لانے کے لئے میں مبین بھائی کو ہی تکلیف دوں گی۔

''میرے ساحر سے کچھ کہو'' ماہنامہ پاکیزہ میں سلسلے وار چھپا اور اپنے منفرد موضوع کی وجہ سے پسند کیا گیا۔ ''میرے ساحر سے کچھ کہو'' کی کہانی میری دوسری تحریروں سے یکسر مختلف موضوع پر ہے اور یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔ مجھے آپ کی رائے کا اظہار بذریعہ پبلشرز انتظار رہے گا۔

دعا گو

شازیہ چوہدری

میری زندگی کی بے رنگ، سپاٹ اور بے کشش صبحوں کی طرح وہ بھی ایک عام سی روایتی صبح تھی۔ مگر اتنی بے کیف اور ملگجی سی کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جواب میرا دل ہی دے سکتا تھا۔

دل جو نارسائی کے کرب تلے پڑا سسکیاں لے رہا تھا۔

دل جو انتقام اور بے بسی کی سرخ آگ میں جل رہا تھا۔

دل جہاں اُداسی اور ویرانی کے اندھیرے رقصاں تھے۔

دل جہاں سے زندگی کی ہر مسرت رخصت ہو چکی تھی۔

کتنا ''بے چارہ'' تھا میرا دل۔ میرے اندر ہی کی طرح خالی، کھوکھلا اور تشنہ کام۔ میں بے دلی سے کھڑکیوں کے دبیز پردے ہٹاتا ہوا تساہل سے اُٹھ بیٹھا۔

صبح اپنے تمام تر آثار و شواہد اور ہنگامہ خیزی کے ہمراہ روشن ہو چکی تھی۔ ہر کسی کو اپنی اپنی جگہ جلدی پہنچنے کی دُھن سوار تھی۔ سیما آپا آرمی میں ڈاکٹر ہیں۔ انہیں سی ایم ایچ پہنچنے کی عجلت تھی۔ سیما آپا سے بڑے راحت بھائی فیکٹری جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اُن کی بیوی ثریا بھابھی اپنے بچوں قیصر اور گڑیا کو اسکول بھیجنے کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ سرفراز بھیا ہاتھ میں ٹائی سنبھالے اپنی نئی نویلی دلہن کو پکار رہے تھے۔ ایاز حساب کتاب کا کھاتہ کھولے ڈائننگ ٹیبل پر رجسٹر رکھے جھکا ہوا تھا۔ امی جان تخت پر بیٹھی سرفراز بھیا کی دلہن ثمرہ سے کچھ کہہ رہی تھیں اور ابا جان لاؤنج میں ٹی وی کے آگے ڈٹے شوق و ذوق سے صبح کی نشریات دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے آپ میں گم تھا۔

ہر کسی کی اپنی دنیا تھی، جس میں وہ شاد و آباد اور خود مگن تھا۔

ایک میں تھا۔ تنہا، تشنہ اور تارکُ الدنیا۔

اپنے آپ کو بھی اجنبی اور غیر محسوس ہوتا تھا۔

یوں جیسے بغیر بنیاد کے مکان ہو۔

جیسے بغیر درخت کے شاخیں۔

یا پھر یوں جیسے ڈار سے بچھڑی کونج۔

جانے اجنبیّت اور تنہائی کی یہ دنیا دل کی بستی میں ''آباد کاری'' کے نتیجے میں ہاتھ آئی تھی یا ازل سے میرے ساتھ چل رہی تھی' یہ فیصلہ مجھ سے آج تک نہ ہو سکا تھا۔ مگر یہ بات طے تھی کہ اس بھرے پُرے تعیش محل جیسے گھر میں کسی دل میں میرے لیے نرم گوشہ اور اپنائیت بھری پناہ نہ تھی۔

مجھ سے کسی کو کوئی ہمدردی یا چاہت نہ تھی۔ میرے دل کے اُجڑے بکھرے نگر تک کسی کی رسائی نہ تھی۔ جب سے تنزیلہ رحمٰن میری زندگی میں بہار بن کر آئی تھی' میرے گھر والوں کی نظریں یک بیک بدلتی چلی گئی تھیں۔ اُن کے انداز بیگانے اور چہرے درشت ہوتے گئے تھے۔ اس لیے کہ وہ میری تایازاد اور بچپن کی منگیتر ماہرہ کی راہ میں کوئی رُکاوٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

وہ ہر صورت ماہرہ کو اس گھر میں بہو کی حیثیت سے چلتا پھرتا دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ سگے تایا کی بیٹی تھی' دوسرے بچپن کی منگ اور تیسرا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ ایاز کا رشتہ تایا کی ماہرہ سے بڑی طاہرہ سے ایاز کی خواہش پر طے کرنے کے بارے میں گھر میں صلاح و مشورے ہو رہے تھے۔ ایسے میں ماہرہ سے رشتہ توڑنے کا مطلب یہ تھا کہ دونوں رشتوں سے جواب مل جائے اور ایاز ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ وہ جی جان سے طاہرہ کا دیوانہ تھا۔ کتنی عجیب بات تھی ایاز جو مجھ سے ڈھائی برس بڑا تھا' اس نے بھی وہی جرم کیا تھا یعنی ''جرمِ محبت'' مگر خاندان والے اسے معتوب کرنے کی بجائے اُلٹا اس کا ساتھ دے رہے تھے اور دل سے خواہاں تھے کہ اس کی محبت ضرور کامیابی حاصل کرے۔

اس کے برعکس میں تنزیلہ رحمٰن کی چاہ کر کے گویا کوئی عظیم گناہ کر بیٹھا تھا۔ میرا ''جرم'' بھی وہی تھا مگر اس کی سزا' ایاز کے بالکل برعکس تھی۔

ایاز کو تو اُس کا جرم معتبر بنا گیا تھا' جب کہ مجھے یہ جرم ''معتوب'' ٹھہرا گیا تھا۔ دو سال قبل جب میں نے ایف ایس سی کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو یہیں مجھے تنزیلہ رحمٰن ٹکرا گئی۔ وہ ٹیکسٹائل کے شعبے میں تھی اور مجھ سے دو سال سینئر تھی۔ نظر و دل نے پہلی ہی ملاقات میں

ایک دوسرے کے حق میں فیصلہ دے دیا اور دو دل ایک ہی لے پہ دھڑکنے لگے۔ دو سال محبت کے ہنڈولے میں جھولتے گزر گئے اور اب جب کہ اُس کی محبت میری رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی تو اچانک ہی وقت کی ساکن جھیل میں ایک پتھر آن گرا۔

ابا جان اور امی ایاز کا رشتہ طاہرہ کے لیے طے کرنا چاہتے تھے مگر اس سے قبل وہ میرا اور ماہرہ کا نکاح کرنا چاہتے تھے کیونکہ تایا جان کی طرف سے بھی یہی اصرار تھا۔ ہر چند کہ میں اور ماہرہ اپنی اپنی جگہ گھر میں سب سے آخری اولاد تھے اور اصولاً پہلے ایاز کی منگنی یا شادی کا سوچنا چاہیے تھا مگر چونکہ ماہرہ کی پیدائش کے وقت ہی امی تائی امّاں سے اسے میرے لئے مانگ چکی تھیں اس لیے یہ رشتہ مدتوں سے طے ہو چکا تھا اور اس حساب سے اس کو پہلے نپٹانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ حالانکہ ابھی میری عمر ہی کیا تھی۔ ابھی انجینئرنگ مکمل ہونے کے لئے تین سال کا عرصہ درکار تھا۔ میں نے اس کو بنیاد بنا کر احتجاج بھی کیا مگر امی نے سہولت سے یہ احتجاج رد کر دیا۔

''یہ تعلیم وغیرہ تو تمہارا اپنا شوق ہے ورنہ تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔ اپنی فیکٹری ہے۔ اتنا بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ تم آج یونیورسٹی چھوڑ کے بھائیوں کے ساتھ اپنا کاروبار شروع کر لو بھلے سے۔ تمہارے بھائیوں نے کون سی بڑی بڑی ڈگریاں لے رکھی ہیں۔ یہ اپنا راحت اور سرفراز میٹرک پاس ہیں۔ ایاز نے ایف اے کرنے کے بعد اسٹور سنبھال لیا تھا۔ تم نے تو اُن سے زیادہ علم حاصل کر لیا ہے اور سچ پوچھو تو بچے' تمہیں اتنی مغز ماری کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم نے کون سی نوکری کروانی ہے۔ اپنا بزنس ہے۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔''

اور یہ سچ بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے معاشی اعتبار سے ہمارا شمار شہر کے کھاتے پیتے متمول افراد میں ہوتا تھا بلکہ اپنے خاندان برادری میں سب سے زیادہ خوشحال ہم ہی تھے۔ تایا اکبر اپنی آل اولاد سمیت اسلام آباد میں رہتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا ابتصار کسی بڑی کمپنی میں ایک شعبے کا انچارج تھا اسی کے بل بوتے پر چھ بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانا چل رہا تھا۔ ابتصار بھائی سے چھوٹا اظہار ان دنوں باہر جانے کے چکروں میں تھا۔ تین بڑی بہنیں تو اپنے گھر کی ہو چکی تھیں اور بال بچے دار تھیں۔ باقی تین میں سے ایک کا نکاح سعودیہ میں رشتے برادری کے ایک بندے سے ہو چکا تھا' پیچھے طاہرہ اور ماہرہ رہ گئی تھیں۔

میں ڈنکے کی چوٹ پر تنزیلہ رحمٰن سے ایفائے عہد نبھانے کا اعلان کر چکا تھا اور اسی روز سے

گھر میں زبردست جنگ شروع ہو گئی تھی۔ ہر کوئی مقدور بھر لعن طعن کر چکا تو پیار محبت سے کام لے کر مجھے راضی کرنے لگا مگر میں بھلا اپنی زندگی کو کیسے ہار سکتا تھا۔

میں اپنا آپ کو کیسے خود اپنے ہاتھوں دفن کر دیتا۔

تنزیلہ جس نے مجھے زندگی سے پیار کرنا سکھایا تھا۔

جس کی قربت میں مجھے پہلی بار یہ ادراک ہوا کہ پیار کسے کہتے ہیں۔

جس نے میری سُونی' بے رنگ اور ویران زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر دیے تھے۔ جس سے مل کر زندگی پیاری لگنے لگی تھی۔

جس کی ایک جھلک میرا پور پور سیراب کر دیتی تھی۔

جس کی اِک نگاہِ محبوبی مجھے خود اپنی نگاہوں میں مغرور بنا دیا کرتی تھی۔

جس کی ہنسی میرے انگ انگ میں گلاب کھلا دیتی تھی۔

جس کی موجودگی مجھے دو جہاں کے درد و غم بھلا دیتی تھی۔

اس کے جذبات' اس کی شدتیں' اس کی چاہتیں' اس کے پیارے کے ہزار ہا وارفتہ و پیوستہ انداز' بھلا انہیں کھو کر میں جی سکتا تھا۔

میں کیسے دستبردار ہو سکتا تھا' اپنی متاعِ جان سے۔

وہی تو تھی جس نے مجھے صحیح معنوں میں پیار کی لذت سے آشنا کر دیا تھا۔

''ثریا بیگم پوچھ رہی ہیں' ناشتہ کمرے میں کریں گے یا ہال کمرے میں آئیں گے؟''

ہماری خاندانی ملازمہ ہاجراں دروازہ بجا کر کمرے میں چلی آئی تھی۔

میں نے بیزاری سے اس کی صورت دیکھی اور بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ''میرے کھانے کی تو جیسے بڑی فکریں لگی ہوئی ہیں۔ کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ جا' ایک کپ چائے لا دے بس۔'' میرے لہجے میں جھنجلاہٹ اور تحقیر تھی۔ جب انسان کا اندر اُبل رہا ہو تو وہ یونہی ہر کسی پر اُلٹ پڑتا ہے۔

ہاجراں میرا بگڑا موڈ دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ امی اسے پانچ چھ سال قبل گاؤں سے لائی تھیں' اس کے ساتھ اس کا خاوند الٰہی بخش تھا جو گھر کا سودا سلف لانے' خواتین کے لیے ڈرائیوری کرنے' لان کی دیکھ بھال کرنے اور صفائی ستھرائی میں اپنی بیوی کا ہاتھ بٹانے پر مامور تھا۔ ہمارا بنیادی تعلق تو گاؤں سے ہی تھا۔ ساری برادری اُدھر ہی بستی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ ابا جان کا

زمینداری میں جی نہ لگا تو کاروبار کرنے کی غرض سے لاہور شہر آ گئے۔ یہاں ایسا بزنس سیٹ ہوا کہ پھر یہیں گھر بنا کر اپنی فیملی کو بلوا لیا۔ اس وقت راحت بھائی اور سرفراز بھیا بہت چھوٹے سے تھے۔ سیما آپا گود میں تھیں۔ ایاز اور میں البتہ لاہور شہر میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اب تو بیس پچیس برس ہو گئے تھے شہر میں آباد ہوئے تو رہن سہن اور نشست و برخاست کے طریقے بھی بدل گئے تھے' تاہم تھوڑی بہت جھلک بہر حال پائی جاتی تھی۔ امی اور ابا جان تو اپنے گاؤں کے رشتے داروں میں گھل مل کر ان جیسے ہی بن جاتے تھے۔ ہم بچے بہر حال کسی نہ کسی لحاظ سے اپنے کزنز میں ممتاز رہتے تھے۔ اکبر تایا اپنی فیملی سمیت گاؤں میں ہی ہوتے تھے پہلے۔ آٹھ دس سال قبل اُن کے سب سے بڑے بیٹے ابتصار کو اسلام آباد میں نوکری کیا ملی گویا گھر والوں کی قسمت بدل گئی۔ ابتصار بھائی نے اسلام آباد میں کرائے کا مکان لے کر آہستہ آہستہ ساری فیملی کو تایا اور تائی سمیت شہر بلوا لیا۔ تایا اکبر اور اُن کی فیملی شہر جا کر نت نئی سہولتوں کے اس طرح عادی ہو گئے کہ پھر گاؤں پلٹنے کا نام ہی نہیں لیا۔ ہم لوگ سال میں اہم تہواروں پر چار چھ دفعہ ضرور چکر لگاتے رہتے تھے گاؤں کا۔

میں عجیب چڑچڑے سے انداز میں باتھ روم میں گھس گیا پھر سیاہ ہاف بازوؤں والی شرٹ اور سفید جینز میں ملبوس گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑے ہو کر بال بنانے لگا۔

''یہ آئینے پر اس قدر گرد پڑی ہوئی ہے' نظر نہیں آئی کبھی تجھ کو۔'' ہاجراں چائے کا کپ دینے آئی تو میری پیشانی کی لکیریں اور کڑے تیور اسے سہانے لگے۔

''وہ جی۔ میں نے ابھی کل ہی تو صفائی کی تھی' خود اپنے ہاتھوں سے' میں دوبارہ کر دیتی ہوں۔'' وہ گھبرائی لرزتی کانپتی اپنے دوپٹے سے ہی آئینہ صاف کرنے لگی۔

''اسٹوپڈ۔ میرے سامنے سے تو ہٹو اب۔ پھر کرتی رہنا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔'' میں بے حساب برس پڑا تھا۔

''اور ٹوائلٹ میں ہاتھ سوپ ختم ہونے کے قریب ہے۔ یہ کیا نظر آئے گا تمہیں۔'' دفعتاً مجھے یاد آ گیا' گویا ہاجراں کی نئے سرے سے شامت آ گئی۔

''کتنی بار کہا ہے' باتھ روم کی صفائی کرتے ہوئے ضرورت کی تمام چیزیں چیک کر لیا کرو۔

میرا شیمپو بھی دو چار دفعہ کا مہمان ہے۔ وہ بھی نہیں منگوایا ہوگا الٰہی بخش سے۔ ہاں بھئی' اس گھر میں کسی کو پروا ہے میری ضروریات کی۔'' میں گھول ہی تو گیا تھا غصے سے۔ وہ غریب فوراً صفائیاں دینے لگی۔

''نہیں جی نہیں۔ الٰہی بخش کل ہی آپ کے پسندیدہ شیمپو کی دو بوتلیں لایا ہے' بڑی بیگم (امی جان) نے منگوائی تھیں کہہ کر اور جی' آپ کی پسند کے صابن کی چھ ٹکیاں آج صبح ہی ثریا بیگم نے مجھے دی تھیں' آپ کے باتھ روم کی کیبنٹ میں رکھنے کے لیے۔'' میں ہمیشہ امپورٹڈ باتھ سوپ استعمال کرتا تھا اور اس معاملے میں بہت حساس تھا۔ میرا صابن' میرا تاول' میرا شیمپو' میرا باتھ روم اور میرا بیڈ کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ میری چیز صرف میری تھی' بلاشرکتِ غیرے۔ اس سلسلے میں بہت اسٹرکٹ تھا۔ اپنی چیز پر کسی کی بُری نظر بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

''خالی چائے معدے میں اُنڈیل کے جا رہے ہو۔ یہ کون سی عقل مندی ہے۔ بندہ ڈھنگ سے پیٹ تو بھر لے۔'' رسٹ واچ کلائی پر باندھ کر دو چار کتابیں بغل میں دبا کے اپنے ٹریل کی چابیاں ہاتھ میں جھلاتا ہوا میں لاپروائی سے لاؤنج پار کرنے کو تھا' جب امی کی یخ بستہ ناگوار آواز کان میں پڑی۔

''کیا فرق پڑتا۔ پھر آپ کو اس سے غرض۔ بقول آپ کے آپ لوگ مجھے میرے حال پہ چھوڑ چکے ہیں۔'' میں نے تپتے ہوئے سرد انداز میں کہہ کر بے نیازی سے آگے بڑھتے ہوئے کن انکھیوں سے اُن کا ردِ عمل جانچا۔

ان کے چہرے سے غضب جھلکنے لگا تھا۔ برہمی سے ہونٹ چباتے ہوئے بمشکل خود کو کچھ کہنے سے باز رکھے ہوئے تھیں۔

''کیوں ستاتے ہو ہمیں تحریم۔ گھر بھر کو ٹینشن میں مبتلا کر رکھا ہے۔'' سیما آپا نے اپنا اوور آل بازو پر ڈالتے ہوئے پرس میں سے گاگلز تلاش کرتے سے ایک لمحے کو سر اُٹھا کر میری سمت شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

میرے لبوں پر ایک زخمی استہزائیہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔

''ستایا تو مجھے جا رہا ہے اور وہ بھی ناحق۔ ایک کو ایک ہی قصور کے بدلے پھولوں کے گہنے اور دوسرے کو ذلتوں کے ہار ملیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے

دھواں سا بھر گیا تھا۔

''اس نے خاندان کی لڑکی کو پسند کیا ہے اور پھر ہمارا شروع سے ارادہ بھی تھا طاہرہ کے لیے۔'' ابا جان نے ٹی وی اسکرین سے نظر اُٹھا کر غصیلی نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے لقمہ دیا۔

''اچھا' گویا خاندان کی لڑکی پسند کرنا عین کارِ ثواب ہے۔ وہ غالباً کوئی مقدس روح' کوئی پاکیزہ حور ہوتی ہے آسمان سے اُتری ہوئی۔'' میرے انداز میں طنز کے سوا کچھ نہ تھا۔

ابا جان اشتعال میں آ گئے۔ لگے تن فن کرنے۔

''تم تو ہو ہی ناخلف اور نافرمان۔'' وہ جھاگ اُڑانے لگے۔ ''مجھے پہلے ہی پتہ تھا' اس تعلیم نے تمہیں کچھ نہیں دینا سوائے بدتمیزی اور عیاشی کے۔ مفت کا پیسہ بھی برباد ہو رہا ہے۔ ایاز کو دیکھ لو' تم سے صرف ڈھائی برس بڑا ہے اور اتنا بڑا اسٹور چلا رہا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہے اور تم تو بس اسی لیے پیدا ہوئے ہو' پرائے دھن پر اکڑنے کے لیے۔ جب خود کماؤ گے ناں تو پتا چلے گا کہ بھائیوں کی اور باپ کی کمائی پر عیش اُڑانا کتنا آسان ہوا کرتا ہے۔''

میرا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ میری مردانگی' غیرت اور خودداری پر گویا تازیانہ پڑا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ مت کیجئے مجھ پر اتنی 'مہربانیاں۔'' میں خود اپنا خرچہ اُٹھا لیتا ہوں' شام کو کہیں محنت مزدوری کر لوں گا۔ آپ اور بھائی صاحبان اپنے احسانات اور نوازشیں سمیٹ لیجئے بے شک۔'' میں آناً فاناً فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گیا تھا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بات کو کدھر سے کدھر پہنچا دیتے ہیں۔'' امی میرے اس فیصلے پر فوراً چیں بچیں ہو کر ابا جان کو گھورنے لگیں۔ ''اولاد کو پڑھانا لکھانا اس کا مستقبل سنوارنا کوئی احسان ہوا کرتا ہے؟ یہ تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے۔ اور تم نے خبردار جو محنت مزدوری کا سوچا بھی۔ تمہارے ابا جان کا تو وتیرہ ہے' سیدھی بات کہنے کے لیے بھی اسے اُلٹے سرے سے ہی کہیں گے۔ موضوع کچھ اور ہوتا ہے اور یہ کچھ اور لے بیٹھتے ہیں۔''

اور اس سے پہلے کہ دفن شدہ موضوع نئے سرے سے ''تازہ'' کیا جاتا' میں بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ البتہ ابا جان کی استہزائیہ بڑبڑاہٹ نے یہاں تک بھی میرا پیچھا کیا تھا۔

''اُونہہ۔ جیسے کر ہی لے گا ناں' محنت مزدوری۔ بھلا نواب کی اولاد ایسے گھٹیا کام کر سکتی

ہے؟ مل کے پانی پینا تو گوارا نہیں اور محنت مزدوری ضرور ہی کریں گے!!!''

میری کنپٹیاں سُلگنے لگیں۔ اپنا نیا نکور موٹر بائیک اسٹارٹ کرتے سمے میرے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے پہ جمے ہوئے تھے۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی میری نگاہیں محبوب و مطلوب ہستی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئیں۔ اس غضب ناک موڈ میں اُس کے دید کی پھوار اور اس کے قرب کی خوشبو ہی مجھے ٹھنڈا کر سکتی تھی۔

تنزیلہ کی تلاش میں مختلف ڈیپارٹمنٹس میں تاکا جھانکی کرتا ہوا میں حسبِ معمول بے شمار سراہتی ہوئی رشک آمیز نگاہوں کی زد میں تھا۔

میں اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا قائل تو نہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ میری پرسنالٹی میں جنسِ مخالف کے لیے بے پناہ کشش ہے۔

جوانی بڑے بڑوں پہ آتی ہے مگر مجھ پر کچھ زیادہ ہی ٹوٹ کر برسی تھی۔ کچھ اتنا نکھار اور طلسمی چمک عطا کر گئی تھی کہ صنفِ نازک کے لیے مجھ میں بے پناہ جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔ عمر کے حساب سے ابھی میں محض بائیس برس کا ہی تو تھا مگر میرا قد بُت میرا ابھر پور سراپا اور میرا الگر کڑیل شیر جوان مرد کی طرح اتنا مکمل اور جامع تھا کہ لڑکیاں تو لڑکیاں خواتین بھی مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹک جایا کرتی تھیں۔

میری بڑی بڑی گہری چمکدار براؤن آنکھوں میں بقول تنزیلہ کے آدھی دنیا کا فساد چھپا ہوا تھا۔ میرے عنابی گداز رسیلے ہونٹوں پر نفس پرست لڑکیوں کی پیاسی نگاہیں بھونرے کی مانند منڈلایا کرتی تھیں۔ گہرے براؤن لہریئے دار بالوں نے میری کھلتی ہوئی سرخی مائل تر و تازہ رنگت میں غضب کا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ زیادہ غرور تو نہیں کرنا چاہیے مگر یہ بات طے ہے کہ میرا شمار ان مردوں میں ہوتا تھا جن کے سراپے کی پور پور میں جنسِ مخالف کے لیے غضب کی کشش اور دلکشی ہوتی ہے۔ میں سرتاپا صنفِ نازک کو مسحور و مخمور کر دینے کے ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اس کا احساس مجھے گاہے گاہے جلد بے تکلف ہو جانے والی لڑکیاں اپنی گفتگو اور انداز و اشارے سے دلاتی رہتی تھیں۔ دو سال قبل تنزیلہ سے ملاقات سے پہلے کالج میں میری کلاس فیلو ریشم جو الٹرا ماڈرن فیملی سے تعلق رکھتی تھی بُری طرح مجھ پر فدا ہو گئی تھی۔ میرے ایک ایک عضو کی خالصتاً شاعرانہ انداز میں اس طرح تعریف کیا کرتی تھی جیسے عموماً لڑکے لڑکیوں کی کرتے ہیں۔ پہلی بار اسی کی وارفتگانہ

اور مجنونانہ حرکات و سکنات نے مجھ میں یہ احساس پیدا کیا تھا کہ میں ایک طلسمی مرد ہوں جس میں لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی مقناطیسی طاقت ہے۔ اس نے بڑے بے باک انداز میں میری مردانگی، میرے سراپے اور نین نقوش کی توصیف کرتے ہوئے مجھے آگہی کی منزل پر لا کھڑا کیا تھا۔

اسی موڑ سے مجھے اپنے اندر کی خفیہ صلاحیتوں کا پتا چلا کہ میں چاہوں تو اپنی طلسمی مردانہ طاقت کے بل بوتے پر اس دنیا کا تختہ بھی اُلٹ کے رکھ سکتا ہوں اور پھر کچھ ہی عرصے بعد جب یونیورسٹی میں تنزیلہ سے ملاقات ہوئی تو یہ مفروضہ سچ ثابت ہو گیا۔ وہ پہلی نگاہ میں میری اسیر ہو گئی تھی۔

تنزیلہ جس کا شباب سری دیوی کی طرح طوفانی تھا، آنکھیں مادھوری کی طرح مدہوش کُن اور ساحر ہونٹ ریما کی طرح قاتلانہ دلربائی لیے ہوئے اور بال پُرانی فلموں کی اداکارہ شبنم کی طرح گھنے، ناگن کی طرح چمکیلے اور دلکش تھے۔ اگر میں اپنی صنف کا مقناطیسی مرد تھا تو وہ بھی اپنی جنس کے دیگر ارکان میں حسن کی دیوی کی سی حیثیت میں جلوہ گر تھی۔

بے پناہ حسین، شعلہ ساماں اور فتنہ انگیز جوانی کی مالک، ایک دم چھلکتی ہوئی تیز شراب کی بند بوتل کی طرح۔

جو نگاہ کے سامنے آئے تو ایمان ڈول ڈول جائے۔ نظر بہک بہک جائے۔ خمار انگ انگ میں چھلکنے لگے۔ ضبط کے بند ٹوٹ ٹوٹ جائیں۔

اس کا شمار اُن ہوشربا اداؤں والی حسیناؤں میں ہوتا تھا جنہیں دیکھ کر چھونے، چھو کر پکڑنے اور پکڑ کر جکڑنے کو دل چاہتا ہے اور سچ پوچھیے تو میں بھی موقع پا کر کبھی کبھی ایسی جسارتیں کر گزرتا تھا کہ جوانی کے مُنہ زور، سرکش بے لگام فطری جذبے تنہائی کی مشکبار قربتوں میں میرے قابو سے باہر ہو جاتے تھے اور کچھ تنزیلہ کی حوصلہ افزائی بھی شاملِ حال تھی۔ وہ بھی ایسے میں شرمیلی سی سرشاری کے ساتھ خود کو میری مجنونانہ نحبتوں کے سپرد کر دیا کرتی تھی۔

مگر بہرحال پاکیزگی کا حصار قائم رہتا تھا۔ حد پار کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی تھی۔ بالآخر وہ الیکٹریکل کے شعبے کی دردانہ نیازی کے ہمراہ باتیں کرتی ہوئی مل گئی۔ میری طرف نگاہ پڑتے ہی وہ اس سے..... ایکسکیوز کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

سبز چکن کے قیمتی لباس میں سبز کاٹن کا کلف لگا دوپٹہ سنبھالے گلابی مخملیں رخساروں پر جھولتی گھونگریالی لٹوں کو سر کی ہلکی سی جنبش سے پیچھے کرتی ہوئی وہ بڑی سنجیدگی سے میرے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''تم یہاں بیٹھی تھیں اور میں سارا جہاں ڈھونڈ آیا۔'' اس کے من موہنے دلفریب سراپے پر نظر پڑتے ہی میرے اندر برستی تپش خود بخود ٹھہر سی گئی تھی۔

دردانہ سے میری ایف اے سی میں بڑی اچھی دوستی رہی ہے۔ ابھی اچانک مل گئی تو اُس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟'' اُس نے لمحوں میں میرے برہم موڈ کا انداز لگا لیا تھا۔

''یہ چیز ہمارے پاس کہاں ٹکنے لگی۔'' میں نے تلخی سے سر جھٹکا۔ ''خیر چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات ہوگی۔ تم بھی خلافِ معمول کچھ سنجیدہ نظر آ رہی ہو؟''

مجھے اس کی سنجیدگی بُری طرح کھل رہی تھی۔

''ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' اس کا لہجہ بُجھا ہوا اور بوجھل سا تھا۔

میرے اندر کوئی اندیشہ سا لپکنے لگا۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔

ہم دونوں یونیورسٹی سے باہر نکل آئے۔ اسے موٹر بائیک پر بٹھا کر میں ایک تفریحی پارک کے قدرے سنسان اور پُر سکون گوشے میں لے آیا۔ گزشتہ دو برسوں سے ہماری تفصیلی ملاقاتوں کے لیے یہی جگہ مخصوص تھی۔ گھنے درختوں کے جھنڈ میں' ٹھنڈے سکون بخش ماحول میں اپنی جانِ جاناں' اپنی زندگی تنزیلہ کے ہمراہ میں خوابوں کی کیف آور پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے بہت دور نکل جایا کرتا تھا۔ ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں گُم ہو جایا کرتے تھے۔ ہر غم' ہر رنجیدگی ایک دوسرے کی طلسماتی قربت پا کر دور بھاگ جاتی تھی۔

مگر آج یہ ماحول اپنا جادو جگانے اور دھڑکنوں کو شوخ انداز بخشنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ ٹینشن اس قدر تھی کہ طبیعت بدمزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ خلافِ معمول ہم دونوں پر سنجیدگی طاری تھی۔ سبز گھاس پر دوزانوں میرے سامنے بیٹھی تنزیلہ کسی خوبصورت تصویر کی طرح ساکت نظر آ رہی تھی۔ میری اُلجھنوں کی تو خیر اسے خبر ہی تھی مگر اس کے چہرے کا غیر معمولی جمود مجھے چونکائے دے رہا تھا۔

''تم کس خیال میں گُم ہو؟'' میں نے ہاتھ اس کے سامنے لہرا کر متوجہ کیا۔

''میں سوچ رہی ہوں' شاید ہمارے ستارے ایک دوسرے سے خفا ہو گئے ہیں۔ پہلے تمہاری طرف سے مسئلہ پیدا ہوا تھا اور اب میری طرف سے۔'' اس نے چونک کر افسردگی سے مجھے دیکھا۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔

''کیا مطلب۔ تمہاری طرف سے کیا مسئلہ کھڑا ہو گیا؟'' میرے لہجے میں اضطرار تھا۔

میں نے کچھ عرصہ پہلے اسے کہا تھا کہ اپنے گھر میں کر کرواور ڈھکے چُھپے انداز میں بیک گراؤنڈ بھی بتا دینا۔ میں طے کر چکا تھا' ابا جان اور امی راضی ہوں یا نہ ہوں' تنزیلہ کو ہر صورت اپنا کر رہوں گا۔ تنزیلہ اپنے ماں باپ کی بہت لاڈلی تھی۔ باپ مل اونر تھا۔ صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا ارسلان باہر امریکا میں اپنا بزنس سیٹ کیے ہوئے تھا اور اس سے چھوٹی تنزیلہ یہاں لاہور میں والدین کے پاس تھی۔ ہر طرح کے ٹھاٹ باٹ اور آزادی تھی۔ اس کی فیملی ہماری فیملی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ماڈرن' روشن خیال اور کلچرڈ تھی۔ بقول تنزیلہ کے اس کے ممی ڈیڈی میں بہت فرینک نیس تھی۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتے تھے۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے تنزیلہ کے سامنے یہ حل پیش کیا تھا کہ وہ اپنے والدین سے یہ معاملہ ڈسکس کر کے اُنہیں اس بات پر راضی کر لے کہ وہ مجھے ''جیسا ہے جہاں ہے۔'' کی بنیاد پر قبول کر لیں۔

''تم نے اپنے ڈیڈی سے بات کی؟'' مجھے صورت حال جاننے کی سخت بے چینی ہو رہی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے گہری سانس لے کر پیشانی پر جھولتی لٹیں پرے کیں۔

''پھر؟'' میری بے قراری انتہا کو چھو رہی تھی۔

تنزیلہ کا چہرہ متزلزل ہونے لگا۔ اس کی سمندر صفت آنکھوں میں نمی پگھلنے لگی۔

''ڈیڈی نے خلافِ توقع بہت شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ پوری بات سنتے ہی ہتھے سے اُکھڑ گئے۔ کہنے لگے' تمہیں آزادی دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم خود سے اپنا بر تلاش کر کے لے آؤ۔ ہمارے لاڈ پیار کا بہت غلط فائدہ اُٹھایا ہے تم نے۔ ہم تم پہ روک ٹوک نہیں کرتے' پابندیاں نہیں لگاتے' تم سے پوچھ گچھ نہیں کرتے تو کیا سمجھتی ہو کہ تمہیں شترِ بے مہار' بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔ تم نے ہمارے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچائی ہے۔''

"مجھے یقین نہیں آتا تحریم۔ وہ ڈیڈی ہی تھے۔ اُن کے تیور یکسر بدل گئے تھے یہ بات سن کر۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "میں نے بہت صفائی پیش کی۔ بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور آپ کی رضامندی سے ایک ہونا چاہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے سختی سے کہہ دیا کہ اول تو تمہارا یہ اقدام ہی میرے نزدیک ناپسندیدہ اور غلط ہے' دوئم یہ کہ لامحالہ اس لڑکے کے بارے میں ایسا سوچا بھی جائے تو مجھے وہ سرے سے اس قابل ہی نہیں لگتا۔ ابھی انجینئرنگ کا دوسرا سال ہے اُس کا' تم سے بھی دو سال جونیئر ہے۔ کوئی جاب نہیں۔ کوئی تجربہ نہیں' اُسے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے۔ سوم یہ کہ اس کا خاندانی بیک گراؤنڈ خصوصاً گھر والوں کی ناراضگی اور خاندانی مسائل ایسے ہیں کہ اس پرپوزل کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اگر وہ لڑکا کسی اعلیٰ جاب پر ہوتا یا کسی بزنس میں لگا ہوتا اور اس کے والدین پوری رضامندی سے پرپوزل لے کر آتے' تب غور کیا جا سکتا تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں قیامت تک ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔"

تنزیلہ کے ڈیڈی کے خیالات سن کر میرا چہرہ شدتِ غیظ سے سرخ پڑتا گیا۔ میری حد سے زیادہ خوددار' انا پسند اور ضدی طبیعت پر اس کے ڈیڈی کا تبصرہ سخت شاق گزرا تھا۔ تنزیلہ بھی میرا ردِعمل جانچ رہی تھی۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں میرا گلابی مائل مضبوط بھاری ہاتھ تھام کر دباتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

"پلیز تحریم۔ تم دل پر مت لو اِن باتوں کو۔ یقین کرو مجھے خود بھی بہت صدمہ ہوا تھا' ڈیڈی کے درشت انداز پر۔ انہوں نے تو جھڑک کر یا ڈانٹ کر کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی آج تک۔ اور اس سے بڑھ کر افسوس ناک بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھ پر آئندہ تم سے ملنے پر پابندی لگا دی ہے۔ کل ممی سے کہہ رہے تھے' اسے کہو بہت ہے جتنا اس نے پڑھ لیا ہے' اب کوئی ضرورت نہیں یونیورسٹی جانے کی۔ آج بھی بہت مشکل سے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ تھا۔ تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کرنا بھی تو لازم تھا۔ اور خبر ہے' ڈیڈی نے ممی سے کہا ہے کہ میرے لیے آنے والے پرپوزلز کا سنجیدگی سے جائزہ لے کر کسی ایک کے ساتھ بات طے کر دی جائے کچھ ہفتوں بعد۔" وہ سر جھکائے انگلیاں مسل رہی تھی۔

"کیا!" مجھ پر جیسے کوئی آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ صدمے سے گُنگ حالت میں اس کی شکل

دیکھتا رہ گیا۔ تابڑ توڑ حملوں نے جیسے حواس ہی چھین لیے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" میرے بے یقین ضدی لہجے میں ہراس در آیا تھا۔

"مجھے تو خود یقین نہیں آتا تحریم۔" وہ بیچارگی سے بولی۔ "میں بھلا کیا کروں گی' تمہارے بغیر کیسے جی پاؤں گی۔" وہ میرے کندھے سے پیشانی ٹیک کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ میرے اندر جیسے اُبال اُٹھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا' دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا ہو۔ حواس کچھ اس طرح منتشر ہوئے تھے کہ روتی ہوئی تنزیلہ کو دلاسہ دینے کے لیے بھی الفاظ نہیں سُوجھ رہے تھے۔ عجیب بے دھیانی کے عالم میں سوچوں کے اژدہام سے اُلجھ رہا تھا۔

"سنو تنزیلہ۔ ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔" یکایک میرے ذہن میں ترکیب کا کوندا لپکا تھا۔

"کورٹ میرج؟" وہ جیسے کرنٹ کھا کر مجھ سے الگ ہو گئی اور ہکا بکا میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟" میں نے بگڑ کر سوال کیا۔

"تم سے نہیں ہو گی تو اور کس سے ہو گی۔" اس کے واری ہو جانے والے بے ساختہ اظہار نے میرے شعلہ بار بھڑکتے ہوئے تیوروں کو پانی بنا دیا۔ اندر تک سرشاری اُتر آئی تھی۔ اس کے لہجے کا مان اور نگاہ سے چھلکتی نرم نرم چاہت بھری شدتیں میرے دل پر پھوار بن کر برسنے لگیں۔ میں سیر سا ہو گیا۔

"مگر تحریم' ہم کورٹ میرج کیسے کر سکتے ہیں۔ تم سوچو' میرے ڈیڈی' ارسلان بھائی اور پھر تمہارے گھر والوں اور تمہارے بھائیوں پر کیا بیتے گی۔ کتنی رسوائی ہو گی۔ شہر میں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ آخر کو ہمیں رہنا تو یہیں ہے ناں۔" وہ سچ سچ مجھے سمجھا رہی تھی اور یہ سچ ہی تھا۔ خود میں بھی اتنی بڑی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس حد تک انتہائی قدم اُٹھانا ہم دونوں کے لیے ہی ممکن نہیں تھا۔

"پھر کیا کیا جائے؟" میں گومگو کے عالم میں اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"حالات سے سمجھوتا۔" اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے حسرت زدہ تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ میرا دل کٹ سا گیا۔

"نہیں۔نہیں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر کسی طرح اپنے والدین کو راضی کر لو اور ایک بار ڈیڈی سے مل کر انہیں قائل کر لو۔تب ہی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔"

مگر ایسا نہ ہو سکا۔رحمٰن صاحب سے تین چار بار ملا انہیں قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ اُنہوں نے تحقیر بھرے گھر درے انداز میں معذرت کر لی اور ساتھ ہی یہ منحوس خبر بھی سنائی کہ وہ عنقریب تنزیلہ کا رشتہ طے کرنے والے ہیں۔ میں نے ابا جان اور امی کو ساری صورتِ حال واضح طور پر بتاتے ہوئے اپنے موقف کا بھرپور دفاع کیا مگر وہ لوگ کسی صورت مائرہ سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔

"ٹھیک ہے اگر تنزیلہ سے میری شادی نہیں ہوگی تو پھر کسی سے بھی نہیں ہوگی۔" میں نے آخری حربے کے طور پر بچا کر رکھا ہوا یہ تیر بھی ترکش سے نکال لیا۔مگر اُدھر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

"مرضی ہے تمہاری مگر تم بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ وہ لڑکی کبھی بہو بن کر ہمارے گھر نہیں آئے گی۔" امی نے دوٹوک کہا تھا۔

تنزیلہ کافی دنوں سے یونیورسٹی نہیں آ رہی تھی اور میں اس کی جدائی میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ پھر ایک روز الیکٹریکل شعبے والی دردانہ نیازی نے مجھے نیلے رنگ کے لفافے میں بند ایک خط لا تھمایا۔ دردانہ تنزیلہ کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔ گویا اس پر یونیورسٹی آنے کی پابندی لگ چکی تھی اور اب آخری حربے کے طور پر اس نے دردانہ کو پیامبر بنایا تھا۔ میں نے بے چینی سے خط کھول کر پڑھا۔

"عزیز از جان تحریم!

تمہیں دیکھے ہوئے آج ٹھیک ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور حیرت ہے کہ اس کے باوجود دل کی دھڑکنیں ابھی تک چل رہی ہیں۔ یہ ایک ہفتہ کس عذاب میں گزرا ہے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ صبح اُٹھتی ہوں تو شام کا انتظار اور شام ہو جائے تو صبح کا سورج طلوع ہونے کے لیے بے قراری۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا۔ ایک ہفتہ الگ ہو کے کاٹنا مشکل ہو رہا ہے، سوچتی ہوں ساری زندگی کیسے گزر سکے گی تم بن۔ تمہیں خبر ہے تحریم، ڈیڈی

نے میرا رشتہ انگلینڈ میں مقیم کسی بزنس مین جمال احمد سے طے کر دیا ہے۔ تحریم، کیا اب بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ کوئی راہ، کوئی دریچہ، کوئی اُمید کی کرن کچھ تو باقی ہوگا؟" ڈیڈی کو شاید مجھ سے بغاوت کا خدشہ ہوگا جو اُنہوں نے مجھ پر پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ باہر جانے کی آزادی ختم، فون میں اٹینڈ نہیں کر سکتی۔ سوچ سوچ کے دردانہ کو راز دار بنا کر خط کا ذریعہ ڈھونڈا ہے، تم سے رابطہ رکھنے کے لیے۔ اگر کچھ ممکن ہو سکتا ہے تو پلیز ضرور کرو تحریم۔

تمہاری اپنی تنزیلہ۔"

میں کتنی ہی دیر اس کے خط کو بار بار پڑھ کر دُہراتا رہا۔ آنکھوں سے، لبوں سے لگا کر اُس کے لمس کی خوشبو اپنے اندر اُتارتا رہا۔

گھر جا کر میں نے نئے سرے سے ابا جان اور امی سے بات کی مگر بے سود۔ گھر کے کسی فرد کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہ تھی، اس معاملے میں یکہ و تنہا تھا۔ میں نے دردانہ کے ذریعے اس کو خط کا جواب لکھا تھا، ڈھیروں محبتوں اور تسلیوں سے لبریز۔ پھر خطوط کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اس کا تاباں چہرہ تو سامنے نہیں تھا۔ اس کے خطوط رات کی تنہائی میں پڑھ پڑھ کر غمِ ہجر کا کچھ مداوا کر لیتا تھا۔

پھر معلوم ہوا کہ جمال احمد سے اس کے رشتے کی بات پکّی ہو گئی ہے اور ایک دو ماہ کے اندر اس کی شادی ہو جائے گی۔

اس اطلاع نے چنگاری بن کر میری ہستی کا سکون راکھ کر ڈالا۔ وہ دن میرے لیے بہت کڑا تھا۔ شام کو گھر لوٹا تو جسم کا رُواں رُواں تھکن کا احتجاج کر رہا تھا۔ لاؤنج میں حسبِ توقع محفل جمی ہوئی تھی۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے۔ ایک خوشگوار سا ماحول بنا ہوا تھا۔ فضا میں گونجتی یہ مسرت آمیز، سرشار چہکاریں اور ہنسی مذاق، ہتھوڑا بن کر میرے اعصاب پر نوبت بجا گئیں۔ یہ سچ ہے کہ غم اور تکلیف کے وقت ہنستے مسکراتے چہرے اچھے نہیں لگتے، ہنسی زہر لگتی ہے اور مذاق ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں، ہنسی علاجِ غم ہے مگر میرا نظریہ مختلف ہے۔ غم کو غم ہی ہلکا کرتا ہے۔ ہنسی تو تازیانہ بن کے تھکے ہوئے اعصاب کو جھنجھنا ڈالتی ہے۔ ہنسی کی تلقین کرنے والا اُلّو کا پٹھا لگتا ہے۔ اس کے برعکس ہماری طرح افسردہ اور اداس شکل بنا کر ہمارے غم کو شیئر کرنے والے اور ہمارے

ساتھ مل کر افسوس کرنے والے لوگوں کی صحبت میں غم ہلکا پڑنے لگتا ہے۔ یہ احساس پرسکون کر دیتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود ہے جو ان غمناک احساسات کو پوری صحت کے ساتھ محسوس کر سکتا ہے یا یہ کہ وہ بھی اس کا تجربہ کر چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مصیبت میں ہمدرد غمگسار اور راز دار افراد جگری یاروں دوستوں اور من پسند ساتھیوں کے کے مقابلے میں کہیں زیادہ شدت سے یاد آتے ہیں اور ان کی طرف سب سے پہلے دھیان جاتا ہے۔ بقول شاعر۔

بنی نہ بات کہیں بھی تو ہم سے دل نے کہا
وہیں چلو جو ٹھکانے ہیں آزمائے ہوئے

''چائے کا ایک کپ مجھے بھی دینا ہاجراں'' میں کاؤچ پر نیم دراز ہوئے ہوئے تساہل سے بولا۔ ہاجراں ہاتھ میں بڑی سی فلاسک لیے اسی لمحے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے الٰہی بخش ٹرے میں ایک قطار میں ڈھیر سارے کپ لگائے چلا آ رہا تھا۔

''اس میں تمہارا حصہ شامل نہیں ہے۔ گھر کو سرائے سمجھ کو اپنی مرضی سے وقت بے وقت تشریف لانے والوں کے حق حساب کا خیال کون کرے'' قیصر کو تھری کا ٹیبل یاد کرواتے ہوئے راحت بھائی نے بڑے انداز سے طنز کا تیر چلایا تھا۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

''ٹھیک ہے۔ ہاجراں تم حصے داروں کو اُن کا حق دے کر جاؤ' میرے لیے ایک کپ چائے علیحدہ بنا لاؤ''۔ میں نے کرخت لہجے میں ایک دم بوکھلا جانے والی ہاجراں کو آرڈر دیا۔

''مذاق کر رہے تھے تم سے۔ چائے تو فلاسک میں بہتیری ہے۔ تمہارے لیے بھی بچ جائے گی''۔ ثریا بھابھی نے گڑیا کی پونی ٹھیک کرتے ہوئے میاں کی طرف داری کے ساتھ ساتھ میرا بگڑا موڈ ٹھیک کرنے کی بھی کوشش کی مگر مجھے یہ سب کچھ ڈرامہ لگ رہا تھا۔ جان بوجھ کر ہر شخص مجھے زچ کرنے' ستانے اور جلانے پر تلا ہوا تھا۔

''نہیں''۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے''۔ میں اس فلاسک سے چائے نہیں لوں گا۔ مجھے نئی چائے بنا کے دو'' میری تحکم بھری نگاہ ہاجراں پر بات واضح کرنے کے لیے کافی تھی۔ اتنا کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

فلاسک میں پڑی چائے بھی تو تازہ ہے۔ وہ کیا کہتی ہے''۔ امی کو میرا ضدی لہجہ ایک آنکھ نہ

بھایا تھا۔ خواہ مخواہ نئے سرے سے دوبارہ بنوانے کی کیا تک بنتی ہے''۔

''مجھے اس فلاسک سے چائے نہیں پینا''۔ میں ایک ایک لفظ چبا کر بولتا ہوا تمتماتا چہرہ لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاجراں' مجھے کمرے میں چائے لا دو'' میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''ہاں بھئی۔ مفت کا مال ہے۔ لنگر خانہ کھلا ہے۔ خدمت گار حاضر ہیں' نواب صاحب کا جو جی چاہے کریں۔ عیش اُڑائیں۔ کون سا خود سے کمانا پڑتا ہے''۔ ابا کی چڑچڑی' جھنجلائی ہوئی بڑبڑاہٹ نے میرا تعاقب کیا تھا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

''آپ کا یہ طعنہ بھی اب اتار ہی دوں گا۔ فکر نہ کریں''۔ میرا چہرہ غیظ و غضب کی لپک سے سرخ پڑنے لگا۔ میں آندھی طوفان کی طرح سیڑھیاں طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ہاجراں چائے لے کر آ گئی۔

''یہ تازی بنائی ہے یا فلاسک سے ڈالی ہے؟ میں نے ساسر کو ہاتھ لگائے بغیر سیدھا اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دو ٹوک سوال کیا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔ پہلے ہی میں غصے سے اور بدلتے موڈ سے خائف رہا کرتی تھی۔ اب کڑے جارحانہ تفتیشی تیورا سے مزید بے اوسان کرنے لگے تھے۔

''وہ جی' بڑی بیگم نے کہا تھا جی کہ فلاسک سے لے جاؤ۔ یہ جی ابھی پانچ منٹ پہلے ہی تو بنائی تھی میں نے''۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

میں نے دانتوں پر دانت جما کر اس کے ہاتھ سے کپ لیا اور پوری قوت سے باہر اچھال دیا۔ ایک چھناکے کی آواز پیدا ہوئی تھی۔

''جاؤ اور دوبارہ چولہا جلا کر چائے بنا کر لاؤ۔ ہری اپ''۔ وہ میرے مجنونانہ انداز دیکھ کر گولی کی طرح اُلٹے قدموں باہر نکل گئی تھی۔

''اُونہہ'' میں نے غصے سے سر جھٹکا۔ پھر جانے کیا لہر اُٹھی دل سے' دوسرے لمحے میں اضطراری انداز میں کھڑا ہو گیا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا خوبصورت سا بلوریں گلدان اُٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا۔

پھر تو گویا مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ ایک ایک شے توڑنے، نوچنے، جھنجوڑنے اور منتشر کرنے لگا۔ عالم وحشت میں خود اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ بال بکھر کر بری طرح بے ترتیب ہو گئے تھے۔ میری دیوانگی اور وحشتوں کی کوئی انتہا ہی نہ رہی تھی۔ جانے کب تھک ہار بدحال ہو اور پھر دروازہ لاک کر کے اوندھے منہ بستر پر گر گیا۔ بے آواز آنسوؤں سے تکیہ تر ہوتا چلا گیا۔ جانے کیسے، کیوں اور کب۔

♥♥♥

ناکامی اور محرومی کے احساسات روز بروز مجھ پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔

احساس ناکامی اور محرومی اور مایوسی ایگریشن او ڈیپریشن کی طرف لے جاتا ہے۔ دل میں ایک دھواں ایک غبار سا ابھر جاتا ہے۔ جب انسان اس شخص کو جس سے وہ ہرٹ ہوا ہے، کچھ بتانا جتانا یا سلگانا چاہتا ہے مگر ایسا نہیں کر پاتا تو بے بسی کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ یہ آگ رگ رگ میں شرارے دوڑا دیتی ہے لہو میں وحشتیں ناچنے لگتی ہیں مگر ان کثافتوں کو باہر نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ ایسے میں قریب ترین اشیاء متاثر ہوتی ہیں یعنی انسان کے قریبی رشتے دار خاص طور وہ لوگ جو ہمیشہ سے اس کی مانتے اور سنتے آئے ہیں وہ سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں جیسے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے یا عزیز ترین دوست ان سے رویہ اکھڑا اکھڑا بیزار کن بلکہ گر جدار ہو جاتا ہے۔ یہ رویہ دراصل ان کے کسی رویے کی بدولت نہیں ہوتا بلکہ نادانستہ طور پر Scape Goating کے ذریعے وہ اپنے مجروح احساسات کی تسکین کرنا چاہ رہا ہوتا ہے۔

اپنی جذباتی تذلیل کا بدلہ دوسروں کی عزت نفس پر حملہ کر کے لینے کی راہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ ڈپریشن میں مبتلا شخص بات بے بات غصہ، تلخی، چڑچڑاہٹ، اشتعال اور بدمزاجی اس لیے دکھاتا ہے کہ وہ اپنے اندر کی پامال شدہ محروم، ناکام اور بے حال دنیا کی اذیت ناک سوچوں سے نجات پانا چاہتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ایسے شخص کے اندر کے مسائل ختم ہو جائیں تو اس کے رویوں کی بے ربطی اور ایبنارمیلٹی بھی خود بخود غائب ہو جاتی ہے۔ مگر یہ اندر کے مسائل کیسے ختم ہوں!!!

یہی نکتہ میرے تمام تر منتشر، بے ربط، بے ضابطہ اور جارحانہ رویوں کا باعث بن گیا تھا۔ میرے اندر اعصابی توڑ پھوڑ پر مشتمل ایک عظیم خلفشار برپا ہو چکا تھا۔ ساری دنیا سے کٹ کر اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ نہ کسی سے بات کرتا اور نہ کوئی میرے بگڑے اور بکھرے تیور دیکھ کر

پاس آتا تھا۔

اس روز سیما آپا جانے کیسے چلی آئیں۔ میں حسبِ معمول سیاہ جینز اور میلی سی آسمانی شرٹ میں سگریٹ کے دُھوئیں کے مرغولے بناتا سپاٹ جامد نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ انہوں نے میری شکستہ حالت پر ایک افسوس ناک نگاہ ڈالی اور پھر آزردہ سی ہو کر میرے بیڈ کے کنارے پر ٹِک گئیں۔ اُن کی آنکھوں میں میرے لیے اپنائیت بھری ہمدردانہ نمی تھی۔ میں جوں کا توں ساکت پڑا رہا۔ جانے کیا ہو گیا تھا کہ ہر احساس جیسے پتھر بن گیا تھا۔ اندر کچھ اُترتا ہی نہ تھا۔ بس ایک ہی کیفیت منجمد ہو گئی تھی کہ وہ راحتِ جاں ارمانوں کی سرخ گٹھڑی بنی کسی اور کے سنگ ملاپ کی وہ منزلیں طے کر رہی ہے جس کے خواب دو سالوں سے میری پلکوں کے منڈیروں سے اُتر کر چھم سے آنکھوں میں جھلملاتے رہے تھے۔ دردانہ کے توسط سے ملنے والے اس کے آخری خط سے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔

''تحریم۔ تم نے خود کو کمرے میں کیوں بند کر رکھا ہے میرے بھائی؟''

''بس یونہی کسی سے ملنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔'' میں گہری سانس لے کر اُٹھ کر بیٹھتا ہوا مدھم سے بے نیاز لہجے میں گویا ہوا۔

''زندگی ایک کمرے تک محدود ہو جانے کا نام نہیں ہے تحریم۔'' وہ مجھے سہج سہج سمجھانے لگیں۔ ''بھلا اس طرح مقید ہو کر گزر سکتی ہے اتنی طویل عمر۔ اگر انسانوں سے ملنا جلنا اور رابطے رکھنا ختم کر دو گے تو پھر زندگی میں کیا اُمنگ لے کر جیو گے۔'' وہ دلسوزی سے کہہ رہی تھیں۔

''امی بتا رہی تھیں کہ تم آج کل یونیورسٹی بھی نہیں جا رہے۔''

''میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔'' میرے بیزار کُن لہجے پر وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

''مگر کیوں۔ تم نے تو اتنے شوق سے داخلہ لیا تھا۔ انجینئر بننا تو تمہارا خواب تھا۔ اور پھر اگر چھوڑنا ہی تھا تو ڈھائی سال پہلے ہی چھوڑ دیتے۔ اب تو تمہارا آدھا سفر طے ہو چکا ہے۔ تمہارا تیسرا سال شروع ہو چکا ہے' محض ایک سال مزید رہتا ہے۔ یہ حماقت نہ کرو تحریم۔ کیوں اپنا مستقبل تباہ کرتے ہو۔''

''کون سا مستقبل۔ کیسا مستقبل۔ مجھے اب کسی شے کی پروا نہیں رہی۔' میرے لہجے میں جنون اُتر آیا تھا۔

بھلا میں کس دل سے یونیورسٹی جوائن کرتا۔ اب تو حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ پہلے تنزیلہ کی دید

اور قربت کی چاہ میں رات سے صبح نہیں ہو پاتی تھی مگر اب تو یونیورسٹی جا کر اُلٹا دل گھبرانے لگتا تھا۔ اس کے ہمراہ گزری حسین ساعتیں نگاہ میں پھرنے لگتیں۔ وہ جگہیں' سیڑھیاں' لائبریری' کینٹین' سرسبز درختوں کے جُھنڈ' لان میں پھولوں کی مہکتی ہوئی کیاریوں کے پھول غرضیکہ ہر ہر جگہ جہاں اُس کے ساتھ وقت بتایا تھا' وہاں قدم رکھتے ہی وہ مانوس منظر بول اُٹھتے تھے۔

انہی راستوں نے جن میں کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہمسفر کہاں ہے

''اس ایک لڑکی کے پیچھے تم ساری دنیا سے ناراض ہو گئے ہو؟ دیکھو' یہ سب جذبے کرتے ہیں' کچھ عرصے بعد تمہیں اِن باتوں کو سوچ کر خود ہی ہنسی آئے گی۔ وقت انسان کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔'' سیما آپا مقدور بھر دانائی استعمال کر رہی تھیں' مجھے راہِ راست پر لانے کے لیے میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

''مگر جذبوں کو بدلنے پر قادر نہیں ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''جذبے بھی بدل جاتے ہیں۔ جب دل بدلتے ہیں تو رشتے بھی بدل جاتے ہیں۔ ہمارے تمام اقوال و اعمال کے تسلسل کا فیصلہ وقت کا گھٹتا بڑھتا چکر کرتا ہے۔''

سیما آپا کی فلسفیانہ باتیں اس وقت مجھے سخت بُری لگ رہی تھیں۔ میں بغیر کسی تاثر کے چُپ چاپ بظاہر انہیں سن رہا تھا مگر درحقیقت ذہن کہیں اور اُڑانیں بھر رہا تھا۔

''دراصل تمام ناکامیوں اور اذیتوں کی جڑ توقع ہوا کرتی ہے' اور اسی سے تعلق کی مضبوطی یا کمزوری کا پتا چلتا ہے۔ توقع جتنی زیادہ ہو گی' ردِ عمل کے طور پر ملنے والا دُکھ بھی اس کے حساب سے زیادہ ہو گا مگر جب توقع ختم کر دی جائے تو انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون آ جاتا ہے۔ اس کے آدھے غم خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ تم بھول کیوں نہیں جاتے کہ تم تنزیلہ نامی کسی لڑکی سے جذباتی طور پر قریب رہے ہو۔ تم اُسے بھلا دو۔ دیکھو' ابھی ساری عمر پڑی ہے۔ ایک لڑکی کے پیچھے اسے تو تباہ نہیں کیا جا سکتا ناں۔''

''آپا پلیز۔ یہ وعظ و نصیحت کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیں۔'' میں بے طرح چڑ کر لجاجت سے مخاطب ہوا تھا۔

وہ بُرا مان کر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ٹھیک ہے۔ نہیں تو نہ سہی۔ بھلا تو اُس کا کیا جاتا ہے جو خود بھی اپنی بھلائی کا طالب ہو۔ جو

شخص خود اپنا دشمن بن بیٹھا ہو اُس کے ساتھ کوئی کیا نیکی کرے۔" وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ میں نے ایک گہرا بوجھل سانس لیتے ہوئے اُن کے پیچھے خود بخود بند ہونے والے دروازے کی سمت دیکھا اور پھر بے تاثر انداز میں دوبارہ چھت پر نگاہ جما دی' جہاں تخیل کی مدد سے اسی ستم گر کی تصویر جلوہ گر ہوتی نظر آ رہی تھی۔

♥♥♥

"چلو تمہاری مرضی ہے۔ اگر پڑھائی چھوڑنا چاہتے ہو تو ڈزن میٹر۔ ایسا کرو' میرے ساتھ اسلام آباد چلو۔ میں وہاں تمہیں اپنی کمپنی میں کمپیوٹر سیکشن میں لگوا دوں گا۔ تم نے پٹرومین سے چھ ماہ کا کورس کیا ہے ناں' کمپیوٹر پروگرامنگ کا۔ بس اس سے کام چل جائے گا۔ تم میرے ساتھ اسلام آباد چلو گے تو دیکھنا لاہور شہر کی تمام تلخیاں بھول جاؤ گے۔ بڑا خوب صورت شہر ہے اور اس سے بڑھ کر اس میں بسنے والے خوب صورت اور حسین لوگ۔"

انتصار بھائی اپنے کسی آفیشل کام سے لاہور آئے تو ہمارے ہاں ہی ٹھہرے تھے۔ میرے متعلق معلوم ہوا تو وہ میرے پاس چلے آئے اور بڑے بھرپور انداز میں دل جوئی کرتے ہوئے فراخ دلانہ آفر کی۔

"میں نے جب بھی جاب کے سلسلے میں کچھ سوچا تو سب سے پہلے آپ کے پاس ہی آؤں گا۔ فی الحال میں خود کو کسی قسم کے ذہنی یا پھر تکنیکی کام کے قابل نہیں پاتا۔ میرے اعصاب شکست و ریخت کے مراحل سے گزر کر بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔" میں نے پھیکے سے انداز میں انہیں ٹالنے کو دھیمے سے کہا تھا۔

"بہر حال میری آفر برقرار ہے۔ تم ضرور غور کرنا۔" انہوں نے بھرپور اپنائیت سے کہا۔ چند دن بعد وہ واپس اسلام آباد چلے گئے۔ گھر میں ان دنوں عجیب سی کھچڑی پک رہی تھی۔ کسی زمانے میں اکبر تایا کے ہاں غربت کا راج ہوا کرتا تھا مگر اب انتصار بھائی کے اعلیٰ عہدے پر ترقی کرنے اور اظہار کو اپنے تعلقات کے تھرو باہر بھجوانے میں کامیابی کے بعد اُن کے معاشی حالات سنبھلنے لگے تھے۔ وگرنہ پہلے پہل تو ان کی معاشی بدحالی کے سبب خاندان برادری والے اُنہیں زیادہ گھاس نہیں ڈالتے تھے مگر اب اکبر تایا کی فیملی معتبر بن گئی تھی سب کے لیے۔ خصوصاً انتصار بھائی کے اعلیٰ عہدے اور ٹھاٹ باٹ کی بڑی دھوم تھی۔ وہ انتصار جو کسی زمانے میں راحت بھائی کے پرانے کپڑے جوتے پہن کر اپنی ضروریات پوری کیا کرتا تھا' جو تیرے میرے گھر سے روٹی کھا کر یا مانگ کر اپنا گزارہ کرتا تھا' آج وہ اتنا قابل توجہ بن گیا تھا کہ برادری والے اپنی بیٹیوں کے

رشتے کے لیے اکبر تایا کے گھر کی آس لگائے بیٹھے تھے اور یہ مجھے کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ ان میں ابا جان اور امی بھی شامل تھے۔ وہ سیما آپا اور انتصار بھائی کے رشتے کے لیے تایا سے بات کرنے کا سوچ رہے تھے۔

مجھے اس انکشاف نے مزید کوفت میں مبتلا کر ڈالا۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ ہزار ظاہری خوبیوں کے باوجود انتصار بھائی کے لیے میرے دل میں پسندیدگی کا نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

وہ مجھے عجیب سے لگتے تھے۔ مصنوعی رکھ رکھاؤ، پُر تکلف انداز وہ خود غرضی اور خود پرستی کا چلتا پھرتا اشتہار محسوس ہوتے تھے۔ بظاہر وہ بڑے ہمدردانہ اور مہذب انداز میں مخاطب ہوتے تھے مگر اُن کی ایک ایک ادا سے منافقت اور تصنع کی جھلک ملتی تھی۔ اُن کے لہجے کی گرمجوشی مطلبی سی محسوس ہوتی تھی۔

پھر اُن کا پس پردہ کردار سارے خاندان برادری والوں پر روشن تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں انہیں عورت اور شراب کی چاٹ پڑ چکی تھی جس کے باعث سب رشتے دار اور جان پہچان کے لوگ انتصار بھائی سے متنفر ہو گئے تھے۔

مگر اب وہ رشتے دار اُن کی شخصیت ان کے دبدبے اور اختیار کے گن گاتے نہ تھکتے تھے۔

اس لیے کہ وہ وفاقی دارالحکومت میں ایک مشہور معروف کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز۔ با اختیار اور اثر رسوخ والے تھے اور یہ بات خاندان والوں کے لیے فخر کرنے کے لیے بہت کافی تھی۔ وہی خاندانی لڑکا جس کو اپنا رشتے دار متعارف کراتے ہوئے شرم آیا کرتی تھی، آج خاندان کا ہر بندہ اُن سے رشتے داری جوڑنے اور اُن سے تعلق بنانے کو اپنا اعزاز سمجھتا تھا اور میل ملاپ کے بندوں کے درمیان فخر وغرور سے ذکر کرتا تھا۔ اب اُن کی شخصیت کے عیب اُن کی مستحکم پوزیشن کے پس پردہ چھپ چکے تھے۔ سب لوگ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس پہلو سے نظر چرا رہے تھے مگر میرے دل میں اُن کے لیے کوئی گنجائش پیدا نہ ہوئی تھی۔ اُن کے سابقہ موجودہ کردار کی قابل نفرت داستانیں ان کے لیے کوئی احترام آمیز جذبہ جگانے میں ناکام رہی تھیں۔

مجھے وہ شخص بحیثیت بہنوئی کبھی اچھا نہیں لگ سکتا تھا۔

♥♥♥

فون کی بیل بڑی دیر سے بج رہی تھی۔ جانے سب کہاں جا سوئے تھے۔ تنگ آ کر میں سیڑھیاں طے کر کے کوریڈور میں رکھے فون اسٹینڈ کے قریب آیا اور طوعاً و کرہاً ریسیور اُٹھا کر گویا اس کانوں میں سوراخ کرتی تکلیف دہ آواز کو بلند کرنے کی سبیل کی۔

"ہیلو" میرے لہجے میں زمانے بھر کی کڑواہٹ اور زہر سمویا ہوا تھا مگر دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے گویا مجھ میں چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑا دیا۔ میں اُچھل ہی تو پڑا تھا۔

"یہ تم ہو۔ تم تنزیلہ۔" میری بے ترتیب ہوتی سانسوں کا ارتعاش گواہ تھا کہ اُس کی آواز میرے تن میں گویا روح پھونک ڈالی تھی۔

"تھینک گاڈ۔ میں دعا کر رہی تھی کہ تم ہی فون اُٹھاؤ۔"

اُس نے شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے بے اختیار گہری سانس لی۔

"کیوں کیا ہے تم نے فون؟" کتنی عجیب بات تھی۔ کہاں تو میں اس سے رابطہ کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا اور کہاں اب اس قدر کٹھور ہو گیا تھا۔ میرا لہجہ خود بخود سخت ہو گیا تھا۔ دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"انسان اسی کو نخرے دکھاتا ہے جس کے بارے میں دل کو مکمل یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے ناز اٹھالے گا۔" "میں نے سنا تھا تم لاہور چھوڑ کر جا رہے ہو۔" اس کی پست سی بھیگی ہوئی آواز میں لرزش اور خدشات کی جھنکار تھی۔

"تو پھر؟" میں نے کرختگی سے کہا۔ انداز میں بے رحمی تھی۔

"تحریم۔۔۔؟" اُس کا تحیر آمیز ملول، بے یقین لہجہ مجھے پگھلانے لگا مگر میں ایک دم جیسے پتھر بن گیا تھا۔

"تم نہ جاؤ گھر چھوڑ کر۔" اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں التجا کی۔

"تو پھر اور کیا کروں؟" میرے تپے ہوئے لہجے میں یاسیت اور شکست خوردگی کے عکس تھے۔ "تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے کسی غیر کے ہمراہ رخصت کروں! تمہاری ڈولی کو کندھا دوں؟ تمہارے دولھا کو سلامی پیش کروں؟ کیا یہ چاہتی ہو تم؟"

میرے انگارہ جملوں نے یقیناً اُس کی پوری ہستی کو راکھ بنا دیا ہوگا۔

"تحریم۔" وہ بے اختیار سسک پڑی۔

میرے دل کو کسی نے مٹھی میں مسل دیا۔ اس کی سسکیاں اعصاب پر بھاری ضربوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

"رونے سے نصیب نہیں بدل جاتے تنزیلہ۔" میں نے بھاری لہجے میں کہا۔ "میں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔۔۔ اور پھر اب تو خود میرے گھر والے مجھے برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں مجھے میری بیکاری اور نکمے پن کا طعنہ دے چکے ہیں۔ اب میں نے سوچ لیا ہے' تب ہی انہیں شکل دکھاؤں گا' جب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنی ذات پر اپنی خفیہ صلاحیت و طاقت پر اعتماد ہے۔ میں کیوں کسی کا احسان لوں' کسی کی باتیں سنوں۔ چھوڑ رہا ہوں میں سب کچھ۔ بہت ناگوار محسوس ہوتا ہے ناں میرا وجود۔ میں اب ان نظروں سے ہی دور ہو جاؤں گا۔ سب کی نیندیں بحال ہو جائیں گی۔ بہت تکلیف دہ ہے ناں میری ذات۔ بہت ناخوش رہتے ہیں لوگ میری وجہ سے۔ یہاں سے چلا جاؤں گا تو سب کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں گے اور تمہارے والد محترم کے تفکرات بھی دور ہو جائیں گے۔ انہوں نے راتوں رات تمہاری رخصتی کے انتظامات کر لیے ہیں کہ میں کہیں رنگ میں بھنگ نہ ڈال دوں۔ اب سب خوش ہو جائیں گے۔"

میں استہزائیہ ہنستا ہوا بمشکل دل کا کرب چھپا رہا تھا۔ تنزیلہ مسلسل رو رہی تھی۔

"اسلام آباد جا کر کہاں ٹھہرو گے؟ مجھے وہاں کا ایڈریس یا کانٹیکٹ نمبر دے دو۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دیوانے کی منزل کہاں ہوگی۔ جہاں سینگ سمائے چلا جاؤں گا۔" میں لاپروائی سے سر جھٹک کر کہا۔

"پھر بھی کہیں تو ٹھہرو گے ناں۔" وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

"ظاہر ہے' کچھ روز تو اکبر تایا کے ہاں رہوں گا۔ شاید اُن کے گھر میں فون کی کی سہولت نہیں

ہے۔ البتہ تم انتصار بھائی کی 'اسٹار کو' کمپنی کے نمبر نوٹ کر لو۔ میرا اُن کی کمپنی میں جاب کرنے کا ارادہ ہے۔ آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"جانے سے پہلے مجھ سے ملو گے تحریم!" وہ رہ نہیں سکی تو دھیمے بے تاب لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کر گئی۔ بلا کی آس اور اُمید کی جوت تھی انداز میں

میرے دل میں اُمنگوں کا موسم جوان ہونے لگا۔ اس کو دیکھنے' اس کو چھونے' اس کو محسوس کرنے کو تو میرا من بھی مدتوں سے ترس رہا تھا۔ میں سیکنڈ کے ہزرویں حصے میں "ہاں" کہنا چاہتا تھا مگر پھر یک لخت درمیان میں جمال احمد کا وجود حائل ہو گیا۔

امنگوں کے موسم میں کھلنے والے پھولوں کے باغوں میں خزاں رقص کرنے لگی۔ میری چیز صرف میری ہے' صرف میرے لیے ہے' اس پر کسی غیر کی نگاہ بھی مجھے گوارا نہیں اگر وہ میری ہے' تو پوری طرح میری دسترس میں ہوگی وگرنہ میں اُسے اپنی ملکیت اور اجارہ داری سے دور کر دیتا ہوں۔

"نہیں۔۔۔؟ جانے کتنی آرزوؤں کا قتل عام شامل تھا اس ایک "نہیں" میں [illegible] سے آنکھ میچ کر جس طرح دانتوں پہ دانت جما کر سختی سے میں لفظ "نہیں" ادا کیا تھا' اس گھڑی کی اذیت میں ہی جانتا تھا۔

"میں آخری بار تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز تحریم۔" وہ بار بار التجا کر رہی تھی

"میں اگر آخری بار تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے چلا آیا تو پھر تم واپس جمال احمد کے ہاں نہیں جا سکو گی۔" میں گہری سانس لے کر سرسراتے ہوئے لہجے میں بالآخر کہہ گیا۔ "تمہیں [illegible] کر میرے ضبط کا پارہ بکھر جائے گا۔ میرا خود پر سے اختیار ختم ہو جائے گا۔ میں تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے پھسلتا' اپنے مقدر کے دامن سے نکلتا برداشت نہیں کر سکوں گا اور ہو سکتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ دیوانگی کے عالم میں تمہیں اپنے ہمراہ لے کر یہاں سے بہت دور چلا جاؤں۔ پیچھے میرے اور تمہارے گھر والوں کے لیے صرف رسوائی اور ذلت رہ جائے گی مگر ہمیں ایک دوسرے کی قربت کی جنت مل جائے گی۔ اگر اتنا حوصلہ ہے تو میں تم سے ملنے کے لیے تیار ہوں بلکہ میں تو شروع سے اس راہ پہ چلنے کے لیے قدم بڑھانے کو بے چین رہا ہوں۔ یہ تو تمہاری بزدلی اور کم ہمتی میرے ہاتھ باندھ کے رکھ دیتی ہے۔ تم نے مجھے' میرے حوصلے کو توڑ کے رکھ دیا تنزیلہ۔"

میرا حرف سلگ رہا تھا۔ میں اپنے حواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔

ریسیور سے اُس کے ہچکیاں لینے اور سسکنے کی دلدوز آوازیں آتی رہیں پھر چند ساعت بعد ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں گم صم سا ریسیور پکڑے کتنی ہی دیر اپنی جگہ ساکت وصامت رہا پھر ٹوٹے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دروازہ لاک کر کے کمرے میں اندھیرا کر کے میں اوندھے منہ بیڈ پر گر گیا اور تکیوں میں منہ چھپا لیا۔ جانے کیسے' کس طرح آنکھوں سے گرم گرم پانی اُبل آیا اور تکیے بھگونے لگا۔ میں نے اس گرم سیال کو بہنے دیا کہ شاید اسی طرح دل کی تپش میں کچھ کمی واقع ہو جائے۔ ہر چند کہ آگ بجھنے والی نہیں تھی۔

وہ قیامت جو گزرنی تھی گزر بھی گئی دوست
تیرے لہجے کی تھکن میں ترا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آ گئی دوست

امجد سلام امجد کہتے ہیں کہ جب گھر میں اچانک ایسی آگ بھڑک اُٹھے جو چشم زدن میں ہر ایک شے کو اپنی لپیٹ میں لے لے' آگ بجھانا مشکل ہو اور گھر کا اثاثہ بچانا ناممکن ہو تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ جو بچتا ہے' وہی بچاؤ۔

گھر کی سب سے قیمتی چیز ہاتھ لو اور دور نکل جاؤ۔ میرے دل میں بھی ایسی ہی آگ لگی تھی۔

میں نے آنکھوں میں بجھتے ہوئے خواب سمیٹے' یاد کے ٹکڑے دھیان میں رکھے' اس کے خطوط' اس کے تحائف اس کی محبتیں سمیٹیں اور اس آگ میں دل کو جلتا ہوا چھوڑ کر دور نکل آیا۔

اس شام وہ رخصت کا سماں یاد رہے گا
وہ شہر' وہ کوچہ' وہ مکاں یاد رہے گا
.. ٹیس کہ اُبھری تھی ادھر یاد رہے گی
وہ [illegible] کہ اُٹھا تھا یہاں یاد رہے گا

ہم شوق کے شعلے کی لپک بھول بھی جائیں
وہ شمع فسردہ کا دھواں یاد رہے گا
آنکھوں میں سلگتی ہوئی وحشت کے جلو میں
وہ حیرت و حسرت کا جہاں یاد رہے گا
ہم بھول سکے ہیں نہ تجھے بھول سکیں گے
تُو یاد رہے گا ہمیں ہاں یاد رہے گا

♥♥♥

اسلام آباد کے اس چھوٹے سے گھر میں بہت سے لوگ رہتے تھے اور سب کے سب مجھ سے محبت اور اپنائیت سے پیش آ رہے تھے۔ میرا بھرپور خیال رکھ رہے تھے۔ ہر طرح سے میرے آرام اور سکون کو مدِنظر رکھتے۔ ابتصار بھائی نے کہہ دیا تھا' کچھ روز آرام کرلو پھر جب تمہارا موڈ بن جائے جاب کرنے کا تو مجھے بتا دینا۔ تمہارے لیے جگہ میں نے یہاں پہلے سے بنالی ہے۔

وہ لوگ اس دُہرے رشتے کو برقرار رکھنے کے دلی طور پر خواہش مند تھے اور اُڑتی اُڑتی یہ خبر بھی اُن تک پہنچ گئی تھی کہ لڑکا لیت و لعل سے کام لے رہا' سو اب مجھے لبھا رجھا کر رام کرنے کے چکروں میں تھے۔ ماہرہ اس میں پیش پیش تھی۔

یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور شدت سے میرے ساتھ کی خواہاں ہے' اس کا اظہار کبھی سال دو سال بعد اتفاقاً گاؤں میں آمنے سامنے ڈھکے چھپے انداز میں وہ بارہا کر چکی تھی مگر یہاں تو جیسے اسے کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ اُس کی تو گویا مراد بر آئی تھی۔ وہ دیدہ دلیری سے میرے لیے مختص کیے گئے کمرے میں کسی نہ کسی بہانے آ ٹپکتی۔ میرے کھانے پینے' سونے جاگنے' کپڑے جوتے اور دیگر معاملات کا وہی خیال رکھتی تھی مگر میرے دل پہ چڑھنے میں اُسے مسلسل ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔

وہ اس طرح مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی مگر میرے دل کو رتی بھر پروا نہ تھی' اس کے اُلٹے سیدھے ہتھکنڈوں کی۔ میں نے کبھی اسے لفٹ نہیں کروائی تھی۔ ہمیشہ دُھتکارتا رہا تھا۔ اب بھی میری جانب سے مکمل گریز' بیزاری اور رُکھائی کا مظاہرہ ہوتا تھا مگر وہ عجیب ڈھیٹ لڑکی تھی۔ میرے روکھے پن اور سرد رویے کے باوجود اسی چاہت اور والہانہ پن سے میری خدمت کیے جاتی۔ مجھ سے ملنے کی سبیلیں تلاش کرتی رہتی۔

ایک اور چیز جو میں نے نوٹ کی وہ یہ کہ اس گھر میں ہر شخص اپنی الگ زندگی بسر کر رہا تھا' اپنی مرضی اور اپنے طور طریقوں سمیت۔ جس کا جو جی چاہتا' وہ کر گزرتا۔ کوئی کسی کے آگے جوابدہ نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ اور گھریلو امور میں نظم و ضبط کا شدید فقدان دیکھنے میں آیا تھا۔

ہر شخص کا اپنا الگ قبلہ تھا۔ گھر میں جدید سہولیات کی فراوانی تھی مگر انہیں استعمال کرنے کا سلیقہ اور قرینہ ندارد تھا۔ انداز نہایت بھونڈا' پھوہڑ اور احمقانہ ہوتا تھا۔ ہاں ایک چیز کا پورے گھر کو نشہ تھا۔

ڈش کے پروگرام دیکھنے اور وی سی آر پر فلمیں دیکھنے کا۔

اس کے لیے چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص یا قواعد و ضوابط رائج نہیں تھے۔

تایا اکبر اور تائی نوراں سارا دن دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتے تھے۔ مائرہ تو خصوصیت سے انڈین فلموں اور زی ٹی وی کے پروگرامز کی دیوانی تھی۔ ابتصار بھائی تو خیر آفس میں بزی رہتے تھے۔ اظہار باہر چلا گیا تھا۔ اس سے چھوٹے نثار اور نواز بھی کچھ کم شوقین نہیں تھے۔ پھر آئے دن اُن کی چار بیاہی بہنوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے بچوں کی فوج ظفر موج ہمراہ لے کر بھائی کے گھر رہنے کو چلی آتی تھی۔

کوئی بدنظمی سی بدنظمی تھی۔ طاہرہ البتہ سب بہن بھائیوں میں کچھ سلجھی ہوئی اور سُدھری ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ زیادہ تر کچن کے کاموں اور صفائی ستھرائی میں لگی رہتی تھی۔ شاید انہی فلموں اور ڈش اینٹینا کا ''اعجاز'' تھا کہ مائرہ کی نگاہ' ہاتھ' چہرے اور وجود کی اشارتوں اور حرکات و سکنات میں عجب طلب آمیز جذباتیت اور ذومعنی چھیڑ شامل ہو گئی تھی۔

بظاہر وہ ''خطا'' انجانے پن کے عالم میں سرزد ہوتی دکھائی دیتی تھی مگر میں بھی آخر کو ''تجربے کار'' تھا۔ جذبات برت چکا تھا۔ وارفتگی کی برسات میں کئی بار بہک کر تنزیلہ کے ہمراہ بھیگا تھا۔ میرے احساسات ان اتفاقی ''وارداتوں'' کی اساس اور شدت سے بخوبی واقف تھے۔ میں نے لمحوں میں مائرہ کا سراپا پڑھ لیا تھا۔ اس کے انگ انگ میں جوانی کے مُنہ زور تقاضے کوکتے تھے اور میں اس صورتِ حال سے کچھ خوف زدہ سا' سراسیمہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ کہاں تک کنارہ کشی کرتا۔

ذہن پہلے ہی سوچ کے بہت سے خانوں میں بٹا ہوا تھا اور بکھیڑے ہی کیا کم تھے جو اس نئی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی تدبیر سوچنے کی مہلت ملتی۔

اس کا طریقہ واردات بہت انوکھا ہوتا تھا۔

کبھی کھانے کی ٹرے اس طرح پکڑاتی کہ لامحالہ اُس کے ہاتھ میری انگلیوں کا لمس پا جاتے۔

کبھی کپڑے تھماتے ہوئے جیسے اپنا پورا ہاتھ پیش کر دیتی۔

کوئی چیز تھماتے ہوئے اس کی شعوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ممکنہ حد تک میرے قریب ہو کر میرے ہاتھ کی گرفت کا لطف لے سکے۔

میں بستر پر نیم دراز کچھ سوچ رہا ہوتا' کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا تو وہ یونہی بلاوجہ اندر آ کر بستر کے بہت قریب پڑی سائیڈ ٹیبل یا کچھ اونچے کارنس پر رکھی چیزوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتی' صفائی کے بہانے۔ محض میرا قرب پانے کے لیے۔

اس کے یہ سستے سوقیانہ طریقے' جذباتیت اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے بازاری انداز بالکل ویسے ہی تھے' جیسے اکثر طالب علمی کے زمانے میں دیگر لڑکیوں اور کبھی اتفاقاً شوبز سے وابستہ یا ''ریڈ لائٹ ایریا'' سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے مجھ سے ملاقات کے بعد دیکھنے کو ملتے تھے۔

وہی طواف کرتی ہوئی' جذبوں کا بے باک اظہار کرتی' نفس کے نواہشات سے بجی بے تاب کچھ کہتی' کچھ کہنے' کرنے پر اُکساتی نظر۔

وہی اپنے آپ کو تھالی میں رکھ کے پیش کرنے کے گھٹیا انداز۔

اور وہی میری قربت میں نشاط کی چند گھڑیاں گزار کر تسکین حاصل کرنے کی طمع اور درجۂ سیرابی تک پہنچنے کو بے قرار روئیے۔

مجھے کراہت آتی تھی' عورت کے اس روپ سے۔

مائرہ کے لیے تو ویسے بھی دل میں گنجائش نہیں تھی۔ اوپر سے اس کے بازاری اور طیش دلانے والے بے باک انداز نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔

''اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لوں گا مگر اس چڑیل کو نکاح میں نہیں لاؤں گا۔'' میں نے دانت پیس کر سوچا تھا۔

♥♥♥

میں تائی نوراں کے اصرار پر سب کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کسی بچے نے وی سی آر لگا دیا۔ کوئی انڈین فلم لگی ہوئی تھی۔ سب لوگ بہ رضا و رغبت دیکھنے لگے۔ میں بیزار سا ہو کر پرانا سا رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

''کتنا پیارا سین ہے۔ دیکھئے تو۔'' معاً مجھے اپنے بہت قریب سے سرگوشی سی سنائی دی۔ میں نے اپنے دائیں طرف دیکھا' وہ مجھ سے بہت کم فاصلے پر بیٹھی میری طرف ہی متوجہ تھی۔ نظر ملنے پر مسکرائی اور انگلی اُٹھا کر ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔

یونہی بلاوجہ نگاہ اسکرین کی طرف اُٹھی اور پھر جیسے میری رگوں میں خون اُبلنے لگا۔ اتنے واہیات اور بے باک سین کو وہ ''پیارا'' کہہ رہی تھی اور کس دھڑلے سے ایک جوان لڑکے' اپنی ماں بہن اور بھائیوں کے ہمراہ شوق و ذوق سے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ شرم و حیا جیسے تایا اکبر کی فیملی گاؤں میں ہی بھول آئی تھی۔

ہیرو اور ہیروئن قابل اعتراض حد تک ایک دوسرے سے قریب ہو کر چہلیں کر رہے تھے۔

میں نے رخ چہرے اور غیظ بھری نگاہ کے ساتھ اپنی توجہ فوراً اسکرین سے ہٹا لی۔ تائی نوراں' ان کی بڑی بیٹی صابرہ اور مائرہ کی موجودگی میں کم از کم مجھ میں اتنی جسارت نہیں تھی کہ ایسے شرمناک مناظر سے لطف اندوز ہو سکوں۔ ہمارے ہاں ایسی چیز کا تصور بھی موجود نہیں تھا۔

یہ نہیں تھا کہ میں کوئی عابد و زاہد بندہ تھا یا قربتوں کی آغوش میں کھلنے والے گلوں سے انجان تھا۔ مجھے فرشتہ ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں تھا کہ عالم مدہوشی میں لاتعداد دفعہ تنزیلہ کی بے ایمان کر دینے والی قربتوں میں دست و لب بہکے تھے۔ بہت سی غیر اخلاقی اور گستاخ حرکات سرزد ہوئی تھیں۔ جنہیں میں محبت کا حصہ اور حق سمجھ کر ضمیر کو مطمئن کر لیتا تھا۔ مگر حدود و قیود کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔ جنوں خیزیاں برپا بھی ہوتی تھیں تو پاکیزگی کے حصار میں رہتی تھیں۔ نفس کو کھلا نہیں چھوڑا

تھا۔

لیکن یہ لڑکی! اُف خدایا..... اُس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ کتنی منہ زور ہو گئی تھی اُس کی جوانی۔

اور گھر والوں نے جیسے اُس کی طرف سے کان لپیٹ رکھے تھے۔

میں ہونٹ کاٹتا اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھ سے اتنی بے غیرتی کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا کہ گھر کی لڑکیوں اور بزرگ خاتون کے ہمراہ ایسی بے ہودہ موویز دیکھوں۔ اُنہیں تو اپنی جگہ لحاظ نہیں آ رہا تھا' مجھے ہی کرنا پڑا۔ ابھی مجھے کمرے میں آئے کچھ لمحے گزرے ہوں گے چائے کا کپ تھامے مائرہ بھی چلی آئی۔

''لیجیے چائے۔'' بڑی ادا سے کہتے ہوئے چائے پکڑاتے ہوئے وہ اس طرح آگے بڑھی کہ اس کا ریشمی رسّی نما چھوٹا سا دوپٹہ پھسل کر ہاتھوں پہ آ گیا۔ وہ چند ثانیے اسی پوزیشن میں رہی مگر میں نے نگاہ اُٹھا کر نہ دی۔

میں دل ہی دل میں اس کے چارہ ڈالنے والے فتنہ پرور انداز پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

وہ سمجھ رہی تھی' اس طرح کے مظاہروں سے مجھے نفسانی خواہشات کا غلام بنا کر اپنے دائرۂ اختیار میں لے لے گی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایسے معاملات میں' میں اس کا بھی استاد ہوں۔ میرے سامنے اس کے مکر نہیں چل سکتے تھے۔

''آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟'' اس نے مایوس ہو کر پوزیشن بدلی اور سرہانے کی جانب سے بہت قریب آ کر حد درجہ شریں لہجے میں پوچھنے لگی۔

''کتاب۔'' میں نے شاعری کی کتاب پڑھتے ہوئے مختصراً سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ جی چاہ رہا تھا' اس کا سر توڑ کے رکھ دوں۔ آخر وہ میرے خاندان کی لڑکی تھی۔ باہر کی لڑکیوں کی سستی اداؤں پر مجھے کبھی غصہ نہیں آیا تھا کہ وہ اُن کا اپنا لائف اسٹائل تھا۔ مرد باہر کی عورت کی ایسی ادائیں بہ رضا و رغبت انجوائے کر لیتا ہے مگر گھر کی عورت کے سر سے کھسکتا دوپٹہ بھی اس کی غیرت کے لیے چیلنج بن جاتا ہے۔

''تمہیں کوئی کام نہیں ہے تو جاؤ یہاں سے۔'' میں بمشکل تمام اپنے اندر بھڑکتے غیظ و غضب پر قابو پا کر درشتی سے بولا۔

وہ کچھ دیر کو مست مست نظروں سے مجھے دیکھتی کشمکش کے عالم میں کھڑی رہی۔ میں ہونٹ

دباتا ہوا پیشانی پر ناگواری کی شکنیں لیے اپنی نظریں کتاب کے صفحات پر گاڑے بیٹھا رہا۔

''آپ ناراض ہیں مجھ سے؟'' بڑی دیر بعد اُس نے کچھ ملول سے انداز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' میں بدستور نظر اُٹھائے بغیر بیزاری اور تختی کے ملے جلے انداز میں مختصراً کہا۔

''تو پھر اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کس طرح۔'' میں نے غیر ارادی طور پر اس کی سمت دیکھا۔ وہ بھی مجھ پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ نظروں کا تصادم ہوا اور میں تھرّا کر رہ گیا۔

اوہ خدایا۔ یہ لڑکی اس وقت دیوانگی کی سرحدیں چھو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ' لبوں کی لرزش اور آنکھ کی پیاسی کیفیت کھلم کھلا اعلان کر رہی تھی کہ اس کے اندر کون سا لاوا دہک رہا ہے۔

اس کی نظریں میرے بھرپور سراپے کا انگ انگ چھو رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نثار ہو جانے والی' قربان ہو جانے والی' سمٹ کر فنا ہو جانے والی کیفیات رقم تھیں۔ وہ میرے مردانگی سے بھرپور طلسمی مقناطیسی وجود کی برکھا میں بھیگ کر اپنی منہ زور جوانی کو سرفراز کرنا چاہتی تھی۔

میری خاموشی کو میری رضامندی جان کر وہ خود فراموشی کی سی حالت میں بے اختیار میری طرف بڑھی۔

میں خیالوں کی زنجیر سے اُلجھتا ہوش میں آیا تو وہ میرے خاصے نزدیک آ چکی تھی۔

میری رگ رگ میں آگ دہکنے لگی۔ بدن سنسنانے لگا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں نے اسے پرے دھکیل کر ایک زوردار چانٹا مارا اور غرّا کر کہا۔ وہ میرے غضب ناک تیوروں سے ہراساں ہو کر کمرے سے نکل گئی۔ اُس کی نظروں میں بے یقینی اور حیرت کے عکس تھے۔

'عورت اس مقام پر آ کر کتنی غلیظ اور مکروہ ہو جاتی ہے' اپنے بپھرے ہوئے تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا میں تیز تیز قدموں سے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگا کر اندر دہکتے آتش فشاں کو ٹھنڈا کر رہا تھا۔

ماہرہ کے اس درجہ بے حجاب اور بے باک رویّوں کے پیچھے بہت سے عوامل کارفرما تھے۔

خود تایا اکبر بھی اپنے عہد جوانی میں بڑے ''گُل'' کھلا چکے تھے۔ خاصے رنگین مزاج اور

ر ''شوقین'' ہوا کرتے تھے۔

بڑا بیٹا انتصار انہی کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس مقام تک پہنچا تھا۔ انتصار بھائی کی عورت اور شراب سے ضرورت کی حد تک بڑھا ہوا لگاؤ کسی سے ڈھکا چھپا تو نہیں تھا پھر تائی نوراں نے بھی اپنے بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان کے کردار و عادات کو سنوارنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔

اور سب سے بڑھ کر گھر کا بدنظمی اور من مانیوں پر اُکسانے والا ماحول۔ اسی وجہ سے ماہرہ کے اخلاق و کردار کی تعمیر نہیں ہونے پائی تھی۔ ماہرہ ہی کیا سب بہن بھائیوں کے ذہن و کردار اعلیٰ سماجی و معاشرتی' تہذیب و شائستگی اور تمیز و لحاظ سے عاری تھے۔ بڑا بھائی کما رہا تھا اور باقی سب عیش کر رہے تھے۔ گاؤں کے غربت زدہ ماحول سے نکل کر شہر کے عیش و آرام میں پڑ کر سب کچھ بھول چکے تھے۔

چشم سیر نہ ہو تو دل کی حرص کبھی نہیں جاتی اور آنکھ بھری ہوئی تو دنیا کے خزانے بھی کنکر پتھر لگتے ہیں۔ میں شروع سے آسائشات میں پلا بڑھا تھا۔ خوش حالی کی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لیے میرے نزدیک کھانے پینے کی آزادی' ٹی وی' وی سی آر' فریج' اعلیٰ فرنیچر اور فوم کے بیڈز کی سہولیات چنداں اہمیت کی حامل نہیں تھیں مگر تایا اکبر کی فیملی ان کی دستیابی پر پھولے نہیں سماتی تھی۔ وہ لوگ بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑتے' جبکہ میں نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

میرے نزدیک یہ چیزیں محض ضرورت تھیں' جبکہ اُن کے لیے تعیش اور تفریح کا ذریعہ۔ ایک معمولی درجے کا ملازم اپنے حق حلال کے پیسے جوڑ کر نیا سائیکل خریدتا ہے تو اس کے لیے وہی قیمتی کار' ہیلی کاپٹر سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس کی یوں حفاظت کرے گا' گویا وہ سب سے قیمتی حیات ہو۔ کار کا تصور اس کے لیے ناقابل رسائی ہوتا ہے۔

جبکہ ایک اعلیٰ افسر کے نزدیک اپنی کار کی اہمیت ایک ضرورت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ اپنے سے بڑے افسر جیسی بیش قیمت پجارو خریدنے کا تصور یقیناً اس کے لیے بہت دل خوش کن ہوتا ہے اور جب کبھی وہ ایسی سواری خریدنے کی استطاعت پا لیتا ہے تو اس کی سرخوشی کا عالم بھی نرالا ہوتا ہے۔

بیش قیمت پجارو رکھنے والا بڑا افسر اپنی سواری کو کچھ نہیں گردانتا' اس امیر شخص کے نصیبوں پر رشک کرتا ہے جس کے پاس اپنا ذاتی ہیلی کاپٹر ہوتا ہے۔ غرضیکہ جو چیز حاصل کر لی جاتی ہے' اس کا چارم چند روز بعد ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس سے بڑی اور اعلیٰ چیز کے حصول کا سودا سر میں سما جاتا

ہے۔

خواہشات جادو کے کھلونوں کی طرح ہوتی ہیں۔ مل جائیں تو مٹی کی طرح معمولی لگتی ہیں اور پوری نہ ہوں تو سونے کی طرح قیمتی بن جاتی ہیں۔

مجھے آسائشات حاصل رہی تھیں اس لیے میرے نزدیک ان میں کوئی کشش نہیں تھی' جبکہ تایا اکبر کی فیملی کے لیے یہ چیزیں بڑی ایکسائٹنگ' سنسنی خیز اور خوش کن تھیں۔

میرے لیے تو صرف ایک ہی چیز' ایک ہی بات' خوش کن اور سنسنی خیز ہو سکتی تھی۔ تنزیلہ کا حصول' اس کے قرب کی آسائش۔

اُس کی یاد آتے ہی دل کے سوئے ہوئے پرانے درد دوبارہ جاگ اُٹھے۔

کتنی مشکلوں سے دل وحشی کو سمجھا بجھا کر راہ پر ڈالا تھا۔ یکا یک مجھے ہر چیز سے بیزاری ہونے لگی۔

ماحول پر یک لخت دھند سی چھا گئی تھی۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس گھر کے در و دیوار سے نفرت سی ہونے لگی۔

''میر کیا کر رہا ہوں یہاں! کس چیز کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں؟''

یہ خیال دماغ کے ایوان میں گونجا اور پھر میں ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں یہاں چارپائی توڑ کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے کچھ بن کے' کچھ کر کے دکھانا تھا۔

اسی لیے تو گھر سے دربدری قبول کی تھی۔

میں دنیا پر ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ساری دنیا فتح کر سکتا ہوں۔

میں ایک بلند مرتبہ آدمی بننا چاہتا تھا۔ اتنا اعلیٰ' اتنا اونچا کہ سیٹھ رحمٰن جیسے متکبر اور مغرور لوگ میرے قدموں میں لوٹنے لگیں۔

میں اس کی تحقیر زدہ تمسخر اُڑاتی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش اور عاجزی کے رنگ چمکتے دیکھنے کی آرزو میں تڑپ رہا تھا۔

اُس نے اسی وجہ سے تو مجھے ٹھکرایا تھا۔

جمال احمد کے پاس پیسہ تھا' نام تھا' مقام تھا۔

اوراب میں بھی انہی چیزوں کے حصول کے لیے اپنا آپ تج کر دینے کاارادہ باندھنے لگا۔

اگلے روز میں ''اسٹار کو کمپنی'' کے آفس میں تھا۔

♥♥♥

یہاں ویسی ہی چہل پہل' ہلچل اور آنا جانا لگا ہوا تھا جیسا کہ کمپنی کے دفاتر میں ہوا کرتا ہے۔ میں بیزاری صورت بنائے اس وقت انتصار بھائی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

انتصار بھائی ایڈمنسٹریشن اور ایڈورٹائزنگ کے شعبے کے نگراں تھے۔ سارا دن رنگ برنگی دلکش صورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اُن کے ڈیپارٹمنٹ میں خواتین ورکرز کی تعداد زیادہ تھی اور اس کی وجہ اُن کی رنگین مزاج شخصیت بذاتِ خود تھی۔ وہ راجہ اندر بن کر رہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

بڑے لوگوں کے دماغ اپنے مقاصد اور ان کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں' جبکہ سطحی لوگوں کے دماغ ہمیشہ خواہشات اور اُن کی تکمیل کے لیے راہیں تلاش کرنے کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ انتصار بھائی کا شمار لوگوں کی دوسری قسم میں ہوتا تھا۔

کس طرح پیسہ مقابل کی جیب سے نکلوایا جائے اور کس طرح جال بچھا کر سامنے بیٹھی لڑکی کو اپنے دام مین پھنسایا جائے۔ اُن کا دماغ انہی دو معاملات کو سلجھانے اور ترا کیب لڑانے میں مصروف رہتا تھا۔

وہ اسی قسم کے انسان تھے اور اس پر قطعی شرمندہ یا نادم نہیں تھے بلکہ اپنے تئیں وہ خود کو بہت کامیاب' پُرکشش اور مقبول عام شخصیت سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ بے حسی کے لبادے میں ساری عمر گزار دیتے ہیں اور پرواتک نہیں کرتے۔ کمپنی کا مالک کوئی ارب پتی ہی ہوگا جو اتنے بڑے پیمانے پر پھیلے کام اور اتنے کثیر عملے کے اخراجات افورڈ کر رہا تھا۔ یقیناً یہاں جاب کرنے والے ملازمین بڑے خوش نصیب تھے۔ یہ کوئی معمولی کمپنی تو نہیں تھی۔

سرسری سے انداز میں' میں کمپنی کی چار منزلہ وسیع وعریض عمارت کے مختلف حصوں کا جائزہ لے چکا تھا۔ انتصار بھائی نے کمپیوٹر روم دکھا دیا تھا۔ میں کچھ دیر تک یونہی کمپیوٹر کی کی (Key) پر

لے چکا تھا۔ انتصار بھائی نے کمپیوٹر روم دکھا دیا تھا۔ میں کچھ دیر تک یونہی کمپیوٹر کی (Key) پر انگلیاں چلاتا رہا پھر اُکتا کر انتصار بھائی کے کمرے میں چلا آیا۔

غیر ارادی طور پر میری نگاہ بار بار انتصار بھائی کے ٹیبل پر رکھے فون کی طرف جاتی تھی اور ایسے میں دل کی دھڑکنوں کا تیز ہونا واضح طور پر مجھے محسوس ہوتا تھا۔ اب تو گننا بھی ختم کر دیا تھا کہ مجھے وہ بے درد شہر چھوڑے کتنے دن گزر چکے ہیں۔ کیا فائدہ تھا' اس سود و زیاں کے حساب کتاب کا۔

تنزیلہ کو میں نے انتصار بھائی کے آفس کا نمبر اور ایڈریس ہی نوٹ کروایا تھا۔

میں تو آج اتنے دنوں بعد پہلی مرتبہ ''اسٹار کو کمپنی'' کے دفتر آیا تھا۔

''ہوسکتا ہے' اس دوران اس نے فون کیا ہو؟'' میرے ذہن میں خیال کا جھماکا ہوا۔

''اور کیا ہی اچھا ہو جو آج اُس کا فون آجائے؟''

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ میں جسم و جاں میں ایک لطیف سی حدّت آمیز سنسنی دوڑ گئی ہے۔ تو گویا آج بھی' اتنے فاصلوں کے حائل ہونے کے باوجود وہ میرے دھیان گیان اور تصوّر میں جوں کی توں جگمگا رہی تھی۔

''کیا ہوتی ہے یہ محبت......'' میں بے بسی سے دوچار ہو کر خود سے سوال کر رہا تھا۔

''کاش' آج اس کا فون آجائے۔'' میں نے شدت سے دعا کی۔'' کتنا عرصہ بیت گیا ہے اُس کی شہد آگیں آواز سنے' اسے دیکھے' اسے محسوس کیے بنا۔''

میر تصور کے فرش پر اس کا سراپا جھلمل جھلمل رقص کرنے لگا۔

وہ مدہوش کن آنکھیں جن کا سحر ماورائی دنیا میں لے جاتا تھا۔

وہ ریشم سی ناگن زلفیں جن کی چھاؤں چھتنار درختوں کو مات دیتی تھی۔

وہ ہونٹ جن سے چھلکتی مے کے آگے قدیم ترین شرابوں کا نشہ ہیچ تھا۔

وہ چاند چہرہ جس کی تابانیوں کے آگے چاند سورج کے جلوے ماند پڑ جاتے تھے۔

وہ بے ایمان کر دینے والے دلآویز خطوط سے مزین بہکا ڈالنے پر آمادہ دلکش بدن۔

وہ شعلہ قامتی' وہ قاتل ادائی' وہ سحر طراز چال ڈھال' وہ ٹوٹ کر محبت کرنے والے وارفتہ و پیوستہ انداز' وہ اس کی سرشار سپردگی اور مخمور پیش قدمی۔

ان سب کا تصور میرے انگ انگ میں ساغر چٹخانے لگا۔ ایک میٹھی میٹھی تپش سی پھیلتی چلی

یکایک میرے دل میں اس کی طلب کا صحرا پکارنے لگا۔

جذبات کا یہ صحرا سیرابی چاہتا تھا۔ تشنگی' ناآسودگی' محرومی اور ناکامی کے بدہیت جھکڑ جذبوں کے اس صحرا میں جنوں کے بول اُگا رہے تھے۔

پیاس' پیاس' پیاس۔ اَلاماں! میرا رواں رواں انجانی سیماہٹ میں سلگنے لگا۔ یوں لگا جیسے جسم سے کوئی سیال بہہ نکلنے کو آمادہ ہو۔ گلابی مردانہ ہاتھ پر نرم سیاہ بالوں کے جال پسینے سے بھیگنے لگے۔

اس وقت شدّت سے جی ہمک رہا تھا کہ ایک بار صرف ایک بار تنزیلہ کو اپنے روبرو لے آؤں۔ بس ایک بار وہ سامنے آجائے پھر اُسے ساری زندگی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔

وہ کتنا مچل رہی تھی' تڑپ رہی تھی' مجھ سے آخری بار ملنے کو اور میں نے اپنی ضد اور انا پسندی کے زعم میں اُس کی درخواست رد کر دی تھی۔

''میں۔ نے کیوں انکار کیا اُس سے ملنے سے؟'' مجھے خود پر طیش آنے لگا۔ آخری بار تو نظروں کو سیراب کر لیتا۔

جی چاہ رہا تھا' جادو کے زور سے اسے اپنی نگاہ کے سامنے لے آؤں۔

''اگر ایسا ہو جائے تو۔ تو۔'' یہ خیال ہی دھڑکنوں کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ اُسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں جو انتصار بھائی کی ٹیبل پر رکھے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے تنہا اپنے تصورات کی دنیا میں محو تھا' چونک کر اس حصار سے باہر آگیا۔

''صاحب کدھر ہیں جناب؟'' یہ غالباً انتصار بھائی کا اٹینڈنٹ تھا۔

''باہر نکلے ہیں تھوڑی دیر پہلے۔ کہہ رہے تھے' پروڈکشن کے شعبے سے کچھ معلومات لینی ہیں۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اچھا......مس کو اُن سے کوئی کام تھا' وہ اُن کا پوچھ رہی تھیں ابھی باہر۔'' وہ شخص سر ہلا کر مڑا۔

''کونسی مس۔ کیا کوئی ملنے آیا ہے' اُن سے!'' میں نے یونہی اپنی معلومات کے لیے سرسری سا پوچھ لیا تا کہ انتصار بھائی کو بتا سکوں۔

''جی۔ مس تنزیلہ آئی ہیں'' اس نے جواب دیا۔

میرے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں بے یقینی سے ٹکر ٹکر اس کی صورت تک رہا تھا' جیسے وہ ابھی ہنس کر کہے گا۔

''میں تو سر جی مذاق کر رہا تھا۔''

مگر وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکلنے کو تھا۔

''کیا نام لیا تم نے......؟'' سائیں سائیں کرتے کانوں سے بمشکل تمام کانپتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ جی مس تنزیلہ۔''

اب کے اُس نے واضح طور پر نام لیا تھا۔

میرے اعصاب پر جیسے بم کا دھماکا ہوا۔ دل دھک سے رہ گیا۔

''تنزیلہ۔ یہاں۔ کیسے......اور کیوں......؟

کیا وہ گھر سے بھاگ کر آئی ہے؟ جمال احمد سے ناتا توڑ کر آئی ہے؟ یا......یا......ابھی جس کو تصور میں یاد کر رہا تھا' وہ یہاں پہنچ گئی ہے' مگر کسی طرح!

یہ سوالیہ نشان اُس سے مل کر ہی جواب پا سکتا تھا۔ انجانے خدشات سے دھڑ دھڑاتے دل سمیت میں بے تابانہ اُٹھ کر دروازے کی سمت بڑھا تھا کی اُسی لمحے دروازہ از خود کھل گیا۔

♥♥♥

''ہاں بھئی' پارٹنر۔ کیسا لگ رہا ہے یہاں کا ماحول۔ ایڈجسٹ کر لو گے نا۔ یار' اسلام آباد شہر کا فسوں ہی ایسا ہے۔ صاف شفاف' روشن' پرشکون اور زندگی کے لیے کچھ کرنے کچھ کر دکھانے کا جذبہ پیدا کرنے والا۔ تم دیکھنا یہاں رہ کر تم کتنی بے مثال ترقی کرو گے۔ بندہ ایک بار فیلڈ میں آجائے پھر خود بخود پیسے سے پیسہ بنانے اور اُس سے آسائشات خریدنے کی طلب بیدار ہو جاتی ہے۔''

دروازہ کھل کر اندر داخل ہوتے ہوئے ابتصار بھائی اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے بڑے خوشدلی سے مخاطب ہوئے تھے۔ میرا سارا دھیان دروازے سے اُن کے پیچھے کی سمت تھا۔

''وہ......آپ سے ملنے کے لیے غالباً آیا ہے کوئی۔'' میں براہ راست تنزیلہ کا نام نہیں لے سکتا تھا کہ رشتے کی نزاکت کا تقاضا تھا۔ مجبوراً ہی سہی' آخر کو وہ ابھی تک میرے ہونے والے ''سالے'' تھے۔ سو اضطراری لہجے میں محتاط ہو کر پوچھا۔

''ہاں آیا ہوگا کوئی۔ آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔'' انہوں نے بے پروائی سے سر جھٹک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''ابھی آپ کا چوکیدار آیا تھا پیغام لے کر۔'' میں نے اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے انگلیاں چٹخاتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔

اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کہیں سے تھکے ہارے آ رہے تھے اور اس وقت آرام کے موڈ میں تھے۔

''فنانس ڈیپارٹمنٹ سے ''بلاوا'' آیا ہوگا۔ کچھ ڈیوز وغیرہ کلیئر کرانے تھے۔ تم بیٹھو یہاں' میں خود ہی چکر لگا لیتا ہوں پھر اطمینان سے بات ہوگی۔'' کچھ سوچ کر وہ کرسی سے اُٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔

ابھی میں اس چوکی دار کی تلاش میں باہر جانے والا تھا کہ ٹیبل پر رکھے فون کی بیل بجی۔

"جی فرمایئے۔" میں سپاٹ انداز میں ریسیور تھام کر دریافت کیا۔

"انتصار صاحب سے بات کرایئے گا۔" اُدھر سے بے تاثر نسوانی آواز میں کہا گیا۔

"آپ کا نام؟" میں نے نوٹ کرنے کے لیے لیز پیڈ اپنی طرف گھسیٹا۔

"انتصار صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اُدھر سے قدرے خشک انداز میں اپنے سوال کی تکرار کی گئی تھی۔

میں بھنا سا گیا۔ یوں مالکانہ سبھاؤ سے بات کر رہی تھی، جیسے کہیں کی لینڈ لیڈی ہو۔ انداز کی بے نیازی اور پرشاہانہ پن تو کچھ بھی اعلان کر رہے تھے۔

"پہلے آپ اپنا نام بتایئے پھر میں بتاؤں گا کہ وہ تشریف رکھتے ہیں یا نہیں۔" میں بھی ضد میں آ گیا۔

"آپ یہاں نئے بھرتی ہوئے ہیں کیا؟" کافی دیر کے توقف کے بعد اُدھر سے سرد کھردرے انداز میں استفسار کیا گیا۔ دبے دبے لہجے میں پوشیدہ غیظ وغضب بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میری خود پسند اور انا پرست طبیعت پر اس کا جملہ نہایت شاق گزرا۔

"محترمہ! آپ سیدھی طرح اپنا نام اور کام بتایئے اور فون بند کیجیے۔" میں سمجھ گیا تھا کہ میرے خوبصورت مردانہ لہجے کی کشش اُسے بات سے بات نکالنے پر اُکسا رہی ہے۔ میرا لب ولہجہ بہت سحر انگیز تھا۔ نرم، رواں پھوار جیسی گھمبیر مدھ برساتی آواز جنس مخالف کے خوابیدہ جذبات جگانےمیں مہمیز کا کام کرتی تھی۔

"میرا نام تو تنزیلہ ہے اب آپ اپنا "تعارف" کرا دیجیے تا کہ مجھے اپنا "کام" بتانے میں آسانی رہے۔" اُدھر سے چبا چبا کر کہا گیا۔

میری جیسے رگ رگ میں حشر برپا ہو گیا۔ ایک دم جھٹکا سا لگا تھا۔

"تنزیلہ؟" میرے لہجے میں بے یقینی سا استعجاب ٹپک رہا تھا۔

"تم تنزیلہ ہو۔ تنزیلہ!" میری دھڑکنیں اُتھل پتھل ہونے لگیں۔ "میں تحریم ہوں تنزیلہ۔" اُلجھی ہوئی سانسیں درست کرتے ہوئے میں بھرّائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ جو کوئی بھی ہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ آپ سے تفصیلی بات انتصار صاحب خود کریں گے۔ مجھے اس وقت صرف اُن کی لوکیشن کے بارے میں معلومات درکار ہیں کہ وہ اس

وقت کہاں پائے جاتے ہیں۔ انڈر اسٹینڈ۔" اُدھر سے بلا کے تند کاٹ دار لہجے میں جواب آیا۔

"کیا مطلب ہے تنزیلہ۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں تحریم بول رہا ہوں۔" میں اُس کے اتنے اجنبی سے اکھڑے اکھڑے تیکھے تیوروں سے خائف سا ہو کر بولا۔ ایک عجیب سی اُلجھن اور حیرانی کا سامنا تھا۔

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے مسٹر۔" اس نے رکھائی اور بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

میں جیسے سناٹے میں آ گیا۔

"کیا بکواس ہے کون ہو تم؟" میں درحقیقت پریشان ہو گیا تھا۔

"میں تنزیلہ بات کر رہی ہوں۔ کتنی بار بتاؤں اور سنو مسٹر، واٹ ایور یو آر۔ اس انداز میں، آج تک انتصار صاحب کو بھی مجھ سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ میں ایسے لب ولہجے کی عادی نہیں ہوں۔ تم اس انداز میں گفتگو کر کے اپنی شامت بلوا رہے ہو۔" بظاہر بہت دھیمے انداز میں کہا گیا تھا مگر لہجے سے چھلکتا غضب، اور جلال اعصاب منجمد کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ریسیور رکھا جا چکا تھا۔

میری اُلجھن، پریشانی اور تعجب کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ ایک طرف وہ کہہ رہی تھی کہ میں تنزیلہ بات کر رہی ہوں اور دوسری طرف سے اس کا اتنا بیگانہ اور سرد رویہ۔

اور ابھی وہ چوکی دار کہہ رہا تھا کہ مس تنزیلہ بات کرنا چاہ رہی ہیں صاحب سے۔ پھر میں یک دم سیٹ چھوڑ کر باہر آ گیا۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے وہ چوکی دار نظر آ گیا۔

"تم تو کہہ رہے تھے مس تنزیلہ آئی ہیں، انتصار صاحب سے ملاقات کے لیے کہاں ہیں؟" میں ایک سانس میں بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

"وہ آئی تو تھیں مگر پھر اُن کی غیر حاضری پر باہر سے چلی گئیں۔"

"کہاں چلی گئیں؟"

میرے اس سوال پر چوکی دار نے مجھے یوں گھورا، جیسے دیکھ رہا ہو کہ ریک ہونے میں کتنی کسر رہتی ہے۔

"وہ جی، اپنے ڈیپارٹمنٹ میں۔ اُدھر اوپر دوسری منزل پہ۔ وہ فنانس ڈیپارٹمنٹ کی انچارج ہیں ناں۔" چوکی دار نے سر کھجا کر انکشاف کیا۔

میرا وجود جیسے کسی برف کی سل کے نیچے آ گیا۔

میں مرے مرے قدموں سے دوبارہ انتصار بھائی کے کمرے کی طرف چل دیا۔
اپنی حماقت پر بھی جی بھر کے ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا۔
بھلا میں یہ کیوں سمجھ بیٹھا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک ہی تنزیلہ ہے۔
اس نام کی کوئی دوسری لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے ناں..... اور یقیناً وہ وہی حسن تنزیلہ ہو گی۔
"کیسی ہو گی بھلا؟"

کہتے ہیں محبوب کے در کا کتا بھی پیارا لگتا ہے۔ سگِ لیلیٰ کی قدر و قیمت کوئی قیس کے دل سے پوچھے۔ محض اُس کی ہم نام لڑکی اُس کے حوالے سے میرے لیے دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔

یونہی گھومتا گھامتا انتصار بھائی کے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہ کمرے میں موجود تھے اور اُن کے مقابل کرسی پر کوئی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔

انتصار بھائی اور خواتین کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اُن کے کمرے میں کسی خاتون کی موجودگی حیرت کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔

جس چیز نے مجھے چونکایا تھا' وہ اس خاتون کے طرزِ نشست اور چہرے سے جھلکتے تاثرات تھے۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس قدر شان اور آن بان سے بیٹھی ہوئی تھی' جیسے ساری دنیا اس کے قدموں تلے ہو۔ چہرے پر خود اعتمادی' بے نیازی اور نسوانی رعب و دبدبہ جھلک رہا تھا۔ عمر بھی کوئی پچیس چھبیس سال ہو گی یا کم۔ ہو سکتا ہے اس سے زیادہ ہی ہو۔ دکھائی تو اتنے کی ہی دے رہی تھی۔ ناخن سے میز کی سطح کو کھرچتی ہوئی اس خاتون نے ایک اُچٹتی ہوئی سرسری نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر اسی بے نیازی سے دوبارہ انتصار بھائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"آؤ تحریم۔ ابھی میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔ بھئی' تمہاری شکایت پہنچی ہے مجھ تک۔"

"میری شکایت۔" انتصار بھائی کی بات پر میں بھونچکا رہ گیا۔

"میں نے کسی سے کیا لینا دینا ہے سر۔" میں نے اُن کے وزیٹر کی موجودگی میں سنجیدگی سے فارمل ہو کر کہا۔ "میرے لیے تو یہ شہر اجنبی ہے۔ آپ کے علاوہ کسی سے جان پہچان نہیں۔" میں نے سادگی سے وضاحت چاہی۔

"ابھی تم نے ان کا فون اٹینڈ کیا تھا؟ یہ ناراض ہو رہی ہیں کہ تم نے ان سے خاصی بدتمیزی کی تھی۔" انتصار بھائی کا انداز فہمائشی تھا۔

میں نے ناقابلِ فہم انداز میں اُن کی طرف تحیر سے دیکھا۔ میں اُن کے موڈ کا اندازہ لگانے

کی کوشش کر رہا تھا۔ آیا وہ خفا تھے یا محض اس خاتون کو منانے کے لیے سنجیدگی اختیار کی تھی؟

"ان کا فون؟" میں نے ایک غیر ارادی نگاہ خاتون کی طرف ڈالی جس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ ماتھے پر ناگواری کی شکنوں نے جال پھیلا رکھا تھا۔

"ہاں بھئی' یہ مس تنزیلہ اکرام ہیں۔ ہمارے فنانس ڈیپارٹمنٹ کی انچارج۔ ہمارے لیے بے حد قابلِ احترام اور قابلِ فخر خاتون ہیں۔" اسٹار کو کمپنی کی ترقی اور توسیع میں ان کی خدمات مثالی ہیں۔ ان سے تو ہم بھی ڈر کے بات کرتے ہیں۔ تم نے پہلے ہی روز ان کو خفا کر دیا اور کیا بات بتائیں۔ ان کی ناراضگی پورے آفس پر بھاری ہوتی ہے۔ اسٹار کو کے آنر بھی ان کے موڈ کا بہت دھیان رکھتے ہیں اور میں تو کسی صورت انہیں خفا نہیں کر سکتا۔"

انتصار بھائی پُرتکلف طرزِ گفتگو میں تو ماہر تھے' جانے اس وقت بھی تصنع سے کام لے رہے تھے' حسبِ عادت یا سچائی بیان کر رہے تھے۔ میں اس جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میری نظر نے تو اُس کا نام سن کر ہی اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شکل و صورت کے معاملے میں وہ کوئی خاصے کی چیز نہیں تھی۔

عام سی' سادہ سی خاتون تھی۔ نقوش اور سراپے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو پہلی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر لے۔

تنزیلہ رحمٰن اور تنزیلہ اکرام میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ تنزیلہ رحمٰن کے جلتے ہوئے حسن کے آگے تنزیلہ اکرام کا ٹمٹماتا چراغ کیا حیثیت رکھتا تھا۔

ہاں مگر جو شے اس عام سی شخصیت کو خاص اور قابلِ توجہ بناتی تھی' وہ اس کے نقوش کی جاذبیت' چہرے سے جھلکتی خود اعتماد شفافیت' سراپے کی نرمی اور بردباری تھی جس نے مجموعی طور پر اس کی شخصیت کو پُراثر اور دلآویز بنا دیا تھا۔

کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اس عام سی خاتون میں کچھ تھا جس سے مدِمقابل مرعوب ہو جاتا تھا۔ تبھی تو انتصار بھائی جیسا ماہر شکاری خوشامدانہ انداز پر اُتر آیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کو پلیز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"جہاں تک میرا خیال ہے' میں نے ان سے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ ہاں نام اور کام پوچھنے کی جسارت ضرورت کی تھی پھر ان کا نام سن کر میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ تنزیلہ نامی لڑکی میری کلاس فیلو رہی ہے۔ میں سمجھا' اُس کی کال ہے۔ شاید ایسے میں میرا لہجہ کچھ بے تکلف ہو گیا ہو۔ بہر حال میں

رہی ہے۔ میں سمجھا' اُس کی کال ہے۔ شاید ایسے میں میرا لہجہ کچھ بے تکلف ہو گیا ہو۔ بہر حال میں معذرت چاہتا ہوں۔"

خود پر قابو پا کر میں نے ایک طائرانہ نگاہ اُس کے چہرے پر ڈال کر محتاط لہجے میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے مختصر طور پر ساری صورت حال واضح کی پھر میں نے محسوس کیا کہ اس خاتون کے چہرے کے بیزار کن تاثرات اور نگاہوں کا خشمگیں انداز مدھم پڑنے لگا تھا۔

"بہر حال تمہیں احتیاط اور ذمہ داری سے کام لینا چاہیے تھا۔" انتصار بھائی نے سرزنش کی۔" آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اب خوش......" پھر وہ اسے منانے والے انداز میں خوش دلی سے بولے۔

"کوئی بات نہیں۔" اُس نے دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ اس کے نقوش کی سختی پگھل گئی تھی۔ اب لہجے' نگاہ اور چہرے کے تاثرات میں نرمی اور شگفتگی در آئی تھی۔ شاید وہ زیادہ دیر تک ایک بات خود پر طاری رکھ کے پریشان ہونے اور کرنے والوں سے نہیں تھی۔

"غلطی اور غلط فہمی میں اکثر انسان حماقتیں کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک ہے' مسٹر تحریم۔ میں اپنا گلہ واپس لیتی ہوں۔" وہ ایک جائزہ لیتی نگاہ مجھ پر ڈال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں چلتی ہوں۔ آپ بل کلیئر کروا لیجئے۔ میں نے سر سے سائن لے لیے تھے صبح۔" وہ بیگ کندھے پر ڈال کر بادِ صبا کے جھونکے کی طرح میرے قریب سے گزرتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

♥ ♥ ♥

اس روز میں کمپیوٹر روم میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ معاً مجھے پیچھے سے ٹک ٹک کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔ میں نے گردن موڑ کر سامنے کی گلاس وال سے جھانکا اور پھر میرا جی مکدّر سا ہو گیا۔

یہ وہی اُس دان والی خاتون تھی' تنزیلہ اکرام۔ غیر محسوس انداز میں میری ہونٹ بھنچ گئے اور میری پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں نمودار ہونے لگیں۔

جس انداز میں محترمہ سے ٹاکرا ہوا تھا اور نوبت بحث بحثی تک جا پہنچی تھی اس نے مجھے پر اس کے بارے میں خاص بُرا امپریشن ڈالا تھا۔

میرا اس کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ اندر ہی اندر میری شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہے اور محض اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے بے نیازی اور نخوت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ظاہر ہے' وہ انتصار بھائی کی گہری "شناسا" کولیگ تھی' بھلا اُن سے نسبت رکھنے والی عورتیں پاک باز اور شریف ہو سکتی ہیں۔

میں صبح شام یہاں ماڈل گرلز' الٹرا ماڈرن گھرانوں کیا آزاد خیال لڑکیوں اور بجی بی شوخ تتلیوں کی آمد و رفت ملاحظہ کرتا تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر نمبر دو اور نفس پرست چھوکریاں جمگھٹا لگائے رہتی تھیں

میں زیادہ تر کمپیوٹر روم میں ہی محدود رکھتا تھا خود کو۔ کبھی کسی کام سے باہر نکلتا یا انتصار بھائی کے کمرے میں جانا ہوتا تو ان لڑکیوں سے سامنا ہو جاتا تھا اور حسب معمول مجھے دیکھ کر ان کے چہروں اور آنکھوں سے لپکنے والی پسندیدگی' ستائش اور قربت کی طلب سے لتھڑے جذبات آن واحد میں میری حساسیت تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔

میرے لیے یہ چیز کوئی نئی تھی۔ میرے وجود کی طلسمی کشش' عادات و اطوار کی نفاست اور چہرے سے جھلکتا مضبوط' ٹھوس شہزادوں کا سا طنطنہ میری پرسنالٹی کو بہت غیر معمولی اور سحر انگیز بنا

دیتے تھے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے ٹی وی کا ایک پروڈیوسر ناصر حیات کام کی غرض سے اسٹار کو
کمپنی کے مالک سے بات چیت کے لیے آیا تھا تو اتفاق سے عمارت سے باہر نکلتے ہوئے میرا اُس
سے سامنا ہوگیا۔ میری بمشکل دو تین منٹ اُس سے بات چیت رہی ہوگی اور اسی میں وہ میری خفتہ
صلاحیتوں کو جانچ گیا۔

"تحریم! آپ کا قد و قامت' آپ کا اسمارٹ فگر' آپ کی آنکھیں' چہرہ بال اور اس سے بھی
بڑھ کر آپ کا لب ولہجہ اور بول چال یہ سب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آپ کے اندر ایک بہت بڑا
اداکار چھپا ہوا ہے۔ آپ تو بنے بنائے ہیرو ہیں۔ بس تھوڑی سی تراش خراش کی ضرورت ہے۔ ٹیلی
ویژن کو آپ کی صورت میں ایک بہت زبردست فنکار مل جائے گا۔ مجھے یقین ہے اگر آپ فلم لائن
کی طرف آئیں تو دھوم مچادیں گے۔ میں ان دنوں ایک سیریل تیار کر رہا ہوں۔ اس کے لیے جس
ہیرو کا خاکہ میں نے بنایا تھا' آپ اس پر ہو بہو پورا اترتے ہیں۔ کیا خیال ہے' آپ سیریل میں
کام کرنا پسند کریں گے؟"

وہ خاصا معروف پروڈیوسر تھا اور اُس کی طرف سے آفر اپنی جگہ بہت اہمت کی حامل تھی۔
میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آنکھیں بند کرکے ہاں کہہ دیتا مگر میں جنوں کی جس بستی میں قیام پذیر تھا'
وہاں زیاں کے حسابات کا دخل نہیں تھا۔ میں نے بہت سلیقے سے معذرت کرلی۔

"آپ سوچ لیجیے۔ میری آفر بہر حال برقرار ہے۔ سیریل کے لیے باقاعدہ ریہرسل شروع
کرنے میں ایک دو ماہ کا عرصہ لگے گا۔ آپ اچھی طرح غور کرلیجیے۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ میں
یہاں کے مشہور ہوٹل کا مالک بھی ہوں۔ جب جی چاہے رنگ کرکے مجھے مل لیجیے گا۔

میرے لیے ان چیزوں میں فی الحال کوئی کشش نہیں تھی۔

دل کی تختی پر صرف ایک نام رقم تھا۔ دل کے فریم پر صرف ایک صورت روشن تھی۔ زندگی
میں اب کسی اور نام' کسی اور صورت کی نہ ضرورت تھی اور نہ گنجائش۔

جو کچھ میرے لیے تنزیلہ تھی' وہ کوئی بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

اُس کی جگہ کوئی بھی نہیں لے سکتا تھا۔

یہاں کوئی بھی اپنے "ٹیسٹ" کا بندہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ ایک ہفتہ ہوگیا تھا' کمپنی آتے
ہوئے۔ ابھی باقاعدہ طور پر میں نے جاب شروع کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔

فی الحال میں "تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو" والے مقولے پر گامزن تھا۔

فی الحال میں "تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو" والے مقولے پر گامزن تھا۔

ابھی کچھ واضح طور پر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بس ایک بے حسی اور
اُکتاہٹ کے سے عالم میں کمپیوٹر روم میں آزمائشی طور پر کمپیوٹر کے کی بورڈ سے کھیلتا رہتا تھا۔ انتصار
بھائی جو کام پکڑا جاتے اسے دل لگا کر کرنے کی کوشش کرتا مگر بار بار مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کام کے
دوران میرا دماغ اکثر غائب رہتا تھا۔

ہاتھ کہیں چل رہے ہوتے اور دماغ کی برقی کی لہریں کہیں اور محو سفر ہوتی تھیں۔ ٹک ٹک
میری سیٹ کے قریب آکر رُک گئی تھی۔ میں جوں کا توں بیٹھا اپنے کام میں لگا رہا۔

"ایکسکیوزمی۔" اس نے بہت مصروف سے انداز میں بعجلت مخاطب کیا۔ "یہ کچھ لیٹرز ہیں
ضروری نوعیت کے۔ انہیں کمپوز کرنا۔ فوری طور پر درکار ہیں ابھی۔" پھر وہ اپنا دوپٹہ سنبھالتی ہوئے
میرے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "اِن میں کچھ Complications ہیں۔ میں اِدھر آپ
کے پاس بیٹھ کر ساتھ ساتھ آپ کو Correct کرواتی جاتی ہوں۔ سر کو آج یہ فائل لازم بھجوانی
ہے۔"

اُس کے لب و لہجے میں گزشتہ تلخی اور گرماگرمی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اس طرح مجھ سے
مخاطب تھی جیسے برس ہا برس سے دونوں کے مابین خوشگوار تعلقات قائم رہے ہوں۔ بڑا فریش'
شگفتہ اور پرجوش انداز تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا' جیسے وہ آہستہ آہستہ فرینڈنیس کی فضا استوار کر رہی ہے۔ فیلڈ میں کام
کرنے والی لڑکیوں میں خود بخود بے تکلفی اور بولڈنیس اور چرب زبانی آجاتی ہے۔

جب سے تنزیلہ سے دل کا ناتا استوار ہوا تھا' میں نے اس قسم کی تیز طرار اور چالباز لڑکیوں
سے کترانا شروع کردیا تھا۔ اس قسم کے ہتھکنڈے مجھے اپیل نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے جواب میں ایک اُچٹتی ہوئی ناخوشگوار نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ سبز اور سیاہ پرنٹ کے
نفیس اسٹائل کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ سبز دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ بال سیدھے
اور گھنے تھے جنہیں چھوٹی سی چٹیا میں جکڑ لیا گیا تھا۔ بال زیادہ لمبے نہیں تھے' بس شانوں تک پہنچتے
تھے۔ اس کی مانگ بالکل سیدھی تھی البتہ پیشانی پر بائیں کنپٹی کے پاس سے ایک خمدار موٹی
گھونگھریالی لٹ کانوں کے پاس سے ہوتی ہوئی رخساروں کو مس کرتے ہوئے نیچے گردن
کو چھو رہی تھی۔ جسے وہ وقفے وقفے سے کان کے پیچھے اُڑسی لیتی تھی مگر وہ شریر موٹی لٹ پھر

سے کان کے پاس سے پھسل کر گالوں اور گردن کو چومنے لگتی۔

میں ایک لفظ مزید کہے بغیر چپ چاپ اس سے کاغذ لے کر کام کرنا شروع ہو گیا۔ کام کے دوران میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظریں گاہے گاہے میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں اور اس جائزے کی وجہ میں جانتا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ صنف مخالف میری زنجیر کر ڈالنے والی طلسماتی شخصیت سے متاثر نہ ہو۔ میرے چہرے کے نقوش بلاشبہ اتنے دلکش تھے کہ مخاطب نظر ہٹانا بھول جاتا تھا۔

وہ درمیان میں کہیں کہیں ٹوک کر اسپیلنگ اور کومے وغیرہ کی غلطیاں درست کرواتی رہی۔ اُس کے انداز میں بہت سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ بڑے ٹھنڈے میٹھے مگر پُر وقار لہجے میں مخاطب ہوتی تھی مگر میں اُسے کسی قسم کی رعایت دینے کے تیار نہیں تھا۔ میری نظر میں وہ بھی اس بہت سی لڑکیوں میں سے ایک تھی جو ادا و انداز، جسم و جوانی اور لہجے کے لوچ اور اُتار چڑھاؤ سے صنف مخالف کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے شاطرانہ داؤ پیچ آزما کے انہیں اُلّو بناتی ہیں۔ البتہ اس کا طریقہ کار نسبتاً کچھ مہذب اور محتاط تھا۔ اس کے تر و تازہ لہجے میں ایک مخصوص تکلف اور حدِ فاصل تھی۔

بالآخر کام مکمل ہو گیا۔

''ایک بات کہوں؟'' وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے ایک نرم سی نگاہ مجھ پر ڈال کر حد درجہ پُر سکون لہجے میں بولی۔ ''جنگ میں دفاعی انداز اختیار کرنا زیادہ مناسب حکمتِ عملی ہوا کرتی ہے کہ یہ عمل جیت کے بہت قریب پہنچا دیتا ہے۔ جارحانہ انداز اختیار کرنے سے دُہرا نقصان ہوتا ہے۔ اپنی سرحدوں سے باہر نکل کر دشمن کی مرضی کے میدان میں بازی لگانا پڑتی ہے، اس طرح اپنی سرحدیں غیر محفوظ ہو جاتی ہیں اور پُر جوش جذبات میں کبھی وار اُلٹ بھی سکتا ہے۔ یوں نقصان زیادہ اور فائدہ بہت کم ہوتا ہے۔'' اس کے بامعنی گہرے انداز پر میں بری طرح ٹھٹھک گیا۔ حیران نگاہوں سے اس کا چہرہ تاپا۔ وہ بڑی سنجیدگی و سادگی سے کہہ گئی تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں اُلجھ کر بولا۔ واقعتاً میں اُس کا اشارہ نہیں جان سکا تھا۔

وہ ہولے سے مدبّرانہ انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ''حالانکہ یہ سب کچھ آپ کے چہرے پہ لکھا ہوا ہے۔ آپ بغیر کسی ٹھوس وجہ کے خیالی قسم کی انا کو خول چڑھائے بیٹھے ہیں۔ مجھ سے خائف ہو کر آپ نے بطور اختیار کر لیا۔ پہلے مقابل کے لڑنے کے طریقے پر غور کرتے ہیں پھر پانسا پھینکتے

ہیں۔ ضروری تو نہیں تھا کہ میں سابقہ ملاقات کے تناظر میں آپ سے بات کرتی۔''

میں نے بری طرح چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ چہرہ تو پُر سکون ہی تھا البتہ آنکھوں میں تبسم ریز لہریں رقص کر رہی تھیں۔ جیسے کچھ ساعت بعد یہ لہریں ہونٹوں سے سے پھوٹ پڑیں گی۔ کس قدر گہرا مشاہدہ تھا اس کا! شکل دیکھ کر اندر کی کیفیت جان لی تھی۔ واقعی میرا یہی خیال تھا کہ وہ اپنے سابقہ انداز میں رعب، طنطنے اور نخوت سے بات کرے گی اسی لیے میں نے قبل از وقت ردِ عمل کے طور پر چہرے پہ سرد اور بے نیاز کیفیت طاری کر لی تھی۔

''میں حدود سے تجاوز کرتی ہوئی خواہ مخواہ کی بے تکلفی کی قائل نہیں ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کے اس درجہ فرینک لب و لہجے پر میرا یہی ری ایکشن ہوتا پھر یہ کہ کام کے دوران میں غفلت آمیز رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔ انتصار صاحب حالانکہ اختیار و صلاحیت میں مجھ سے کچھ بڑھ کر ہی ہوں گے مگر اُن کسی بھی کام کے معاملے میں، میں غیر جانب داری سے پیش آتی ہوں۔ اس دن ایک تو آپ کا بے مقصد تفتیشی انداز میرے انتہا سے زیادہ خوشگوار موڈ کو چاٹ گیا تھا، دوسرا آپ کا اتنے بے تکلف لہجے میں بے لحاظی سے بات کرنے کا طریقہ مجھے مشتعل کر گیا۔ اس لیے مجھے سختی اور بے مروتی سے کام لینا پڑا۔ ہر چند کہ یہ میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔'' وہ بڑے ٹھہرے ہوئے رواں انداز میں وضاحت کر رہی تھی۔ ''مگر پھر آپ کا موقف سن کر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ آپ نے جس طرح سادہ اور بے ساختہ انداز میں اپنی صفائی پیش کی، وہ مجھے اچھی لگی۔''

اب کی بار وہ خفیف سا مسکرائی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ میں اس مسکراہٹ میں میرے لیے کوئی مخفی پیغام تھا یا محض رواداری نبھائی گئی تھی۔

''سادہ، سچی اور کھری وضاحت مصلحت آمیز چشم پوشی سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ ایک سچا اعتراف دنیا کے آدھے تفکرات سے نجات کا باعث بن جاتا ہے۔ غلطی کا اعتراف اور احساس شرمندگی اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ بھٹکے ہوئے شخص کے لیے ابھی بھلائی کا ایک در کھلا ہوا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ایک بُرا شخص جسے اپنی برائی کا احساس ہے اور وہ اس کا برملا اظہار و اعتراف بھی کرتا ہے، وہ اُس شخص سے کئی گنا زیادہ بہتر ہے جو تھوڑی برائی کا مرتکب ہو کر خود کو نسبتاً بہت معتبر اور نیک سمجھتا ہے اور خود کو برحق گردانتے ہوئے زیادہ برے شخص کی برائی پر نکتہ چین ہو کر۔ اس کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ حالانکہ برائی تو برائی ہوتی ہے، چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔''

اس کی سوچ خاصی میچور تھی۔ میں اب کے بغور اس کو سننے لگا۔ بولا ابھی تک کچھ نہیں

تھا۔ میں دراصل اس کو اندر تک پڑھنا چاہتا تھا کہ وہ درحقیقت کتنے پانی میں ہے۔ کس مزاج کی لڑکی ہے۔ اس لیے دانستہ خاموشی اختیار کر کے اسے کھلنے کا موقع دے رہا تھا۔ اب تک تو وہ ابتصار بھائی کے زنانہ حلقۂ احباب سے خاصی مختلف ثابت ہو رہی تھی مگر اس انفرادیت میں کتنی گہرائی تھی اس کا اندازہ لگانا ابھی دشوار تھا۔ ملمع اترنے کے بعد ہی اصلیت سامنے آسکتی تھی۔

''آپ کے بارے میں ابتصار صاحب نے جب مجھے بعد میں بتایا کہ آپ اُن کے فرسٹ کزن ہیں تو یقین کیجئے' مجھے سخت تعجب ہوا۔ آپ کے چہرے اور لب و لہجے سے جھلکتی بے ساختگی' سادگی اور نرم دلی میں ملاحظہ کر چکی تھی' پہلی ہی ملاقات میں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آپ ابتصار صاحب جیسے شخص کے قریبی عزیز ہو سکتے ہیں۔ بے ریا اور منافقت سے پاک' دل لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے پاس رشتہ و روابط استوار کرنے کے لیے ماسوائے منافقت' مکروفریب' خودغرضی اور چال بازی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اپن کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف فریب ہوتا ہے۔ وہ ہر تعلق دھوکہ دہی کی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں اور پس پردہ محرک محض غرض اور ہوس ہوتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ساری زندگی مخلص اور بے لوث ساتھیوں سے محروم رہتے ہیں۔ ظاہر ہے جو چیز کسی کو دیتے ہیں' وہی جواب میں وصولتے ہیں۔ جو چیز آپ دوسرں کو دینے میں کنجوسی کرتے ہیں' وہ دوسرے کس طرح خوشدلی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ آپ کے حوالے کر سکتے ہیں؟

مگر یہ آسان سا نکتہ آپ کے کزن کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ میری ہزار وضاحتوں کے باوجود اُن کے ڈیپارٹمنٹ میں ہر دو ماہ بعد اسٹاف بدل جاتا ہے۔ جو لوگ آتے ہیں' وہ بہت جلد اُن کی تصنع اور بناوٹ میں چھپی مکروہ شخصیت سے آشنا ہو جاتے ہیں کہ آج کے دور میں ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے نایاب ہو گئے ہیں' ہر کوئی غرض کا بندہ ہے وغیرہ وغیرہ''

اس نے جس فہم و فراست سے کام لے کر ابتصار بھائی کی دہری شخصیت کے انتہائی خفیہ پہلو سے پردہ اُٹھا کر گویا میرے خیالات کی تائید کی تھی' اس نے مجھے حیران حیران کر دیا۔

میرا بھی ابتصار بھائی [illegible] شخصیت کے بارے میں یہی تجزیہ تھا۔ وہ وقعتاً ایسے ہی تھے اور مجھے شدید افسوس ہوتا تھا' جب [illegible] یاں اُن کی قابل نفرت پرسنالٹی پر مر مٹ جاتی تھیں۔ ان کے بناوٹ میں لپٹے مصنوعی گر برس اور دار رفتہ طرز گفتگو پہ ایمان لا کر خود کو آگ سے کھیلنے کی جسارت پہ آمادہ کرتی تھیں۔

مگر یہ خاتون غالباً ہی نہیں بلکہ یقیناً اُن سب سے مختلف تھی۔

اگلے چند روز میں مزید اُسے سمجھنے کا موقع ملا۔

وہ کسی سے مرعوب و مغلوب نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ''چیف باس'' یعنی کمپنی کے مالک سے بھی نہیں۔ انداز بے حد پختہ' پر اعتماد اور کھرا تھا۔ لہجہ دو ٹوک' اور سادہ۔ کام کرنے کا اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ گرمجوش' مصروف اور ہشاش بشاش موڈ میں ہمہ وقت وہ کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی تھی۔ کسی سے ملاقات کرتے ہوئے یا مخاطب ہوتے ہوئے اُس نے کبھی مدِ مقابل کی پرسنالٹی جانچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اپنے مخصوص بھرپور' ٹھوس ذمے دارانہ انداز میں شائستگی و سنجیدگی کے ملے جلے تاثرات لیے سامنے والے بندے پر ایک نگاہ ڈال کر اس سے ڈیلنگ شروع کر دیتی۔ اس کا طرز گفتگو بے حد محتاط اور بردبار سا تھا۔ کہیں سے بھی کوئی ایسی لچک یا گنجائش نہیں چھلکتی تھی جس سے فائدہ اُٹھا کر مخاطب خصوصاً تو مردوں کی قوم اپنی کمند پھینکنے کی جرأت کرتی۔ گو وہ بلاتفریق سب سے نرمی اور سرگرمی سے پیش آتی تھی مگر اس کی ایک ایک ادا اور چہرے کے تاثرات ایک غیر محسوس حدِ فاصل کا تعین کرتے نظر آتے تھے۔ اس نے کبھی کو بھی اس سے بے تکلفی اور بے باکی سے بات کرنے کی رعایت نہیں بخشی تھی۔ اس کی خوشدلی' نرمی اور اخلاص بھری اپنائیت اپنی جگہ مگر جونہی کوئی مخصوص حدود پھلانگ کر اس کی ذات کی بند حویلی میں اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا' وہ کسی وفادار چوکی دار کی طرح اُسے اُٹھا کر پرے پھینک دیتی تھی۔ لمحوں میں اپنا مشفق' مہربان خیر خواہانہ روپ نوچ کر خونخوار شیرنی کا روپ دھار لیتی تھی۔ اسی لیے ابتصار بھائی اس سے اتنا مرعوب تھے اور اپنے تیر شرافت نے ترکش میں واپس رکھ لیے تھے کہ یہاں اُن کا داؤ نہیں چل سکتا تھا۔

مجھے اس کا یہ روپ' یہ انداز بہت بھایا۔ اس کی ذات کی یہی حیران کن مضبوطی اور بھرپوریت مجھے اس کے قریب لے آئی۔ ایک عورت کو اتنا ہی باوقار' پر اعتماد اور پر تمکنت ہونا چاہیے۔ وہ مزدوروں کی فیلڈ میں رہ کر بھی اپنی نمایاں نسوانیت کے رعب اور اپنی ذات کی محفوظ و مستحکم پوزیشن کو برقرار رکھے ہوئے تھی اور پوری آن بان شان سے اپنی شخصیت' ذہانت اور صلاحیت کا سکہ جمائے ہوئے تھی۔ یہ چیز میرے نزدیک بہت قابل تعریف بلکہ خواتین کے لیے قابل تقلید بھی۔ اس کی حوصلہ افزائی' پرامید اور مثبت سوچ کی حامل شگفتہ طبیعت میں کچھ تھا کہ بندہ بے اختیار اُس پر اعتماد کرتے ہوئے دل کھول بیٹھتا تھا۔

''دراصل تنزیلہ میری یونیورسٹی فیلو رہی ہے اور میری پسند بھی۔ میں اُس سے شادی کرنا چاہتا

تھا مگر اس کے اور میرے والدین راضی نہیں ہوئے اور اس کی شادی کہیں اور طے پا گئی۔ میں گھر والوں کی بے اعتنائی اور یہ روح فرسا صدمہ برداشت نہیں کر سکا اور ادھر اسلام آباد اپنے تایا کے ہاں آ گیا۔ تنزیلہ کو میں نے یہاں کا نمبر دے رکھا ہے۔ اس روز اسی وجہ سے مجھ سے غلطی سرزد ہو گئی تھی۔" میں نے دل صاف ہوتے ہی بڑی سادگی سے مختصر ترین الفاظ میں اس کو اپنی زندگی کی کل داستان کہہ دی۔

"اوآئی سی۔" خلاف توقع اُس کی کوئی تفتیشی اور متجسس رگ نہیں پھڑکی تھی جیسا کہ عام طور لوگ ایسی داستانیں سن کر تفصیل جاننے کو بے قرار ہو جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ کرید کرید کر بات سے بات نکالتے جاتے ہیں اور انداز میں چھیڑ خانی اور معنی خیزی جھلکتی ہے۔

اس کے برعکس اس نے بڑے آرام سے سر کو تفہیمی انداز میں ہلا کر لب سی لیے تھے۔

"حالانکہ میں کوئی دل پھینک بندہ نہیں ہوں۔ ہزاروں حسینائیں آگے پیچھے پھرتی ہیں مگر میں نے کسی کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ کوئی دل کو بھایا ہی نہیں مگر تنزیلہ۔ نجانے اس میں کیا تھا کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔" میں اس پری وش کے تصور میں کھو کر بے خود لہجے میں بولا۔

"کیسی تھی وہ"؟ اس نے میری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے رواداری سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں کیسی ہے وہ!" میرے لہجے میں زمانے بھر کا خمار چھلک آیا۔ آنکھوں میں انوکھی سی چمک بیدار ہو گئی۔

"سری دیوی کی طرح فتنہ انگیز سراپا' مادھوری کی سی آنکھیں' شبنم جیسے گھنے سیاہ بال اور ریما جیسے قاتل ہونٹ۔ ان سب کو ایک سانچے میں ڈھالا جائے تو اُس کا سراپا بنتا ہے۔"

اس نے ایک تفصیلی نظر سے میرے چہرے کے تاثرات جانچے' پھر مبہم سے انداز میں مسکرائی۔

"اپنی عمر کی طرح ہی امیچور ہے آپ کی محبت۔ اس عمر میں محبت کرنے کے یہی انداز ہوا کرتے ہیں۔ محبوب کے ہونٹوں' آنکھوں' بالوں اور سراپے سے پھوٹنے والی صنفی کشش کو ہم محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے جذبات واحساسات کے ہمراہ پلنے بڑھنے والی محبتیں محض دودھ کا اُبال ہوتی ہیں۔ جسم کی طلب تو محبت نہیں ہوتی۔ ایسی محبت کا حاصل محض نفسانی خواہشات کی تکمیل کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ محبت بہت مشکل جذبہ ہے اور اسے سمجھنا اور سمجھانا اس سے بڑھ کر وقت طلب ہے" وہ سر جھٹک کر مسکرائی۔

"میری محبت دودھ کا ابال نہیں ہے" مجھے غصہ آ گیا۔ "یہ وقت کے ساتھ بدلنے اور ٹھنڈی ہونے والی نہیں ہے۔ یہ چنگاری مزید بھڑکے گی اور ایک دن آتش فشاں بن کر سب کچھ تباہ و برباد کر دے گی۔"

"بھلا ایسی محبت کا کیا فائدہ جو تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔" میرے جذباتی انداز کے برعکس وہ اسی سکون سے بولی۔

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر اُس کی سمت دیکھا۔

"آپ بھی مخالف کیمپ میں شامل ہونے لگیں۔" میری نظر اُس سے گلہ کر رہی تھی۔

"یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ کے جذبات واحساسات سمجھتی ہوں تحریم مگر مجھے بتائیے' ایک احمقانہ جذباتیت کو کیا خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے؟" وہ تدبّر سے سمجھانے لگی۔ "آپ جس طرح اس کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں' اس سے تو یہی انداز ہوتا ہے کہ آپ اس کی آنکھیں' اس کے ہونٹ اس کے بدن کے مدّاح ہیں اور انہیں پانے کے لیے بے چین ہیں۔ اس کی روح کی طلب نہیں رکھتے۔ نین نقش کی کشش کے علاوہ بھی انسانی شخصیت میں بہت سارے قابل ستائش عناصر شامل ہوتے ہیں' ان پر بھی نگہ کرنی چاہیے۔ محض جسم کا حصول تو حقیقی محبت کے زمرے میں نہیں آتا۔ جسم سے روح تک رسائی حاصل کرو۔ روح کی حقیقت سے آشنائی پانے کی کوشش کرو۔ تب جا کر محبت کامل ہوتی ہے۔"

اس کے حقائق پر مبنی خیالات سن کر میں جھنجھلا سا گیا مگر اس کا مظاہرہ کرنے سے خود کو باز رکھا۔ اب دل میں اس کیلیے لحاظ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک نرم گوشہ بنتا چلا گیا تھا' ایسے میں پہلے کی طرح بے دھڑک اور منہ پھٹ انداز میں بات نہیں کی جا سکتی تھی۔

"اپنے والدین سے ناراضگی کی کیا وجہ ہے؟" کچھ توقف کے بعد وہ رسان سے پوچھنے لگی۔

میرے چہرے پر تلخی کے دیے جھلملانے لگے۔

"اونہہ۔ والدین۔ انہیں کیا پروا۔ میں جیوں یا مروں۔" مجھے یاد آیا' مجھے اسلام آباد آئے پندرہ دن گزر چکے تھے مگر اُدھر سے ایک فون بھی نہیں آیا تھا۔ "وہ تو خوش ہوں گے کہ ایک مصیبت سر سے ٹل گئی۔"

"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ۔" اس نے تاسف سے میری طرف دیکھا۔ "اس میں اُن کا

کیا قصور ہے؟"

جواب میں' میں نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنے گھر والوں کے حسن سلوک کے بارے میں بتا دیا۔

وہ چپ چاپ بغور سنتی رہی پھر ٹھوڑی کے نیچے ہات جما کر قلم سے کاغذ پر آڑی ترچھی لائنیں بناتے کچھ سوچنے لگی۔

"افسوس کہ ایک ناکامی اور مایوسی نے آپ کا یہ حال کر دیا کہ آپ خیر خواہ ہوں اور بد خواہوں میں واضح فرق کو بھی بھول گئے؟ پانی طرف سے منفی گمان نہیں باندھ لینا چاہیے۔ دراصل آپ موجودہ حالات میں غیر جانب داری سے سوچنے سے قاصر ہیں اس لیے آپ کو اپنی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا' سمجھانے بجھانے والا ہر شخص اپنا دشمن نظر آتا ہے اور شاید اس وقت میں بھی یہی رول ادا کر رہی ہوں کیا خیال ہے۔؟"

اس نے بلا کے رسانیت آمیز لہجے میں کہہ کر میری جانب دیکھا۔ میرا سر بے اختیار ہونے سے نفی میں ہل گیا۔ پتا نہیں کیا تاثیر تھی' اس کے لب و لہجے میں کہ میں اس کے وعظ و نصیحت کرنے والے انداز سے اب تک عاجز نہیں آیا تھا ورنہ یہی باتیں امی ابا یا سیما آپا مجھے سناتیں تو میری تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ سرزنش کرنے والا ہر چہرہ مجھے زہر لگتا تھا مگر اس سے اختلاف رائے ہونے کے باوجود میں اُس کی کمپنی سے بور نہیں ہوا تھا۔

"آپ نے کسی سے محبت نہیں کی نا۔ اس لیے اتنی بے اختیاری سے کہہ گزرتی ہیں۔ اس درد سے پالا پڑے گا تو میں آپ سے پوچھوں گا۔"

جواب میں ایک لمحے کو اُس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"اچھا بھئی' میں چلتی ہوں' اپنے ڈیپارٹمنٹ میں۔ وہاں اُلو بول رہے ہوں گے۔" وہ اپنے ہاتھ میں تھامے کاغذ کے کونے موڑتی ہوئی ایکدم ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا فوری ردِ عمل میرے لیے خاص حیران کن تھا۔

"ابھی بیٹھیے نا آپ۔ ایسی بھی کیا جلدی۔" میں نے قدرے مچل کر گزارش کی۔ نجانے کیا بات تھی' اس کی معیت میں کہ وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ اس کے شگفتہ انداز میں لپٹی ناصحانہ باتیں ذہن میں تا دیر شور مچاتی رہتی تھیں۔

"نہیں' چلتی ہوں اب۔ آج مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ میں رات کی فلائٹ سے امی کے

ہمراہ کوئٹہ جا رہی ہوں۔ سر کو چھ روز کی رخصت کے لیے درخواست بھجوانی ہے۔ کچھ دیر میں وہ نکل جائیں گے پھر مصیبت پڑ جائے گی۔" وہ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھی۔

"خیریت ہے؟" اُس کے کوئٹہ جانے کا سن کر میں نے تشویش سے اُس کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں بالکل۔ دراصل میری بہن کی سسرال کوئٹہ میں ہوتی ہے۔ اس کے ہاں نیا مہمان آیا ہے۔ اسی سلسلے میں ننھیال کی طرف سے کچھ دینے دلانے کے لیے ہم لوگ جا رہے ہیں۔" اس کے چہرے پر اپنی بہن کے لیے محبت اور چاہت کے چراغ روشن تھے۔

"واپس کب تک آئیں گی؟"

"ایک آدھ ہفتے بعد۔"

"ایک بات سنیے گا۔" کسی سوچ میں گم واپس پلٹتی ہوئی تنزیلہ اکرام۔ کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں بے اختیار ہی اسے پکار بیٹھا تھا اور اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنا مدعا بیان کروں۔

"کہیے۔ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اس کی نرم آواز نے مجھے حوصلہ دیا۔

"آپ ایک اچھی لڑکی ہیں۔" میں کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔ وہ بہت آہستگی سے مسکرا دی۔ ایک نا قابل فہم مسکراہٹ۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں"

"مجھے پندرہ دن ہو گئے ہیں اسٹار کو میں کام کرتے ہوئے۔ اس دوران آپ کو اچھی طرح پرکھا ہے۔ آپ واقعی بہت سی خوبیوں کی مالک ہیں۔"

"اتنی جلدی نتیجے پر نہیں پہنچ جایا کرتے۔ ضروری نہیں ہے کہ انسان اندر سے بھی ویسا ہو' جیسا بظاہر نظر آتا ہے۔" اُس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر بھٹکنے لگیں۔

"لیکن آپ ایسی ہی ہیں۔" میں نے اپنے لہجے میں وزن پیدا کر۔تے ہوئے کہا۔ "میں بچہ نہیں ہوں مس تنزیلہ۔ چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے تجربوں سے گزرا ہوں۔ ہر طرح کے' روپ کے اور کھال میں لپٹے لوگوں میں ملا ہوں۔ اُن کو جانچا ہے' پرکھا ہے' انسانوں کی پہچان رکھتا ہوں۔ آپ عام لڑکی نہیں ہیں۔ بہت سے حوالوں سے اُن سے مختلف ہیں اور یہی اختلاف اور تضاد آپ کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز و منفرد اور غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ عورت کا یہ روپ بڑا محترم اور مقدس لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں' ایک بہت اچھی لڑکی سے میری وابستگی مستقل بنیادوں پر قائم

رہے۔ کیا آپ اپنا فون نمبر مجھے دے سکتی ہیں؟"

میرے لہجے میں سادگی اور سنجیدگی بھرا اخلاص تھا۔ وہ چونک کر میری آنکھوں میں جھانک کر غالباً وہ میرے کہے ہوئے جملوں کی گہرائی کا اندازہ لگانے لگی۔ میں سہولت سے بیٹھا اُس کے جواب کا منتظر تھا۔

کچھ سوچ کر وہ دروازے سے واپس پلٹ آئی اور اندر آ کر میرے مقابل جم گئی اس کے چہرے پر تفکر اور سوچ کے عکس لہرا رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کس قسم کا تعلق استوار کرنا چاہتے ہیں؟" وہ اندر سے پریشان ہو گئی تھی مگر بظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"جو پاکیزہ اور احترام آمیز جذبات کی بنیاد پر خلوص دل سے دو انسانوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔" میں نے اس کے حیرت اور گھبراہٹ کا اشتہار بنے چہرے پر ایک جاندار نگاہ ڈال کر سچائی سے کہا۔ "اس تعلق کو کوئی بھی نام دے دیا جائے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"مگر میرے نزدیک فرق پڑتا ہے۔" اچانک اس نے سنجیدگی سے کہہ کر مجھے نظروں ہی نظروں میں تولا۔ "تعلق کا نام ہی تو اس کے مقام کا تعین کرتا ہے ورنہ بذاتِ خود تعلق نہیں ہوتا۔ جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں' وہ خود فریبی اور چشم پوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مرد اور عورت میں کوئی دوستی نہیں ہوتی۔ اگر ابتدا میں دوستی کا روپ دھارتی بھی ہے تو آگے چل کر لامحالہ صنفی کشش کے باعث آلودہ ہو کر پاکیزگی کا حصار توڑ لیتی ہے۔ مرد اور عورت آپس میں دوست کیسے بن سکتے ہیں۔ سامنے کی بات ہے' دونوں کے مزاج' رجحانات اور جذبات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔"

"محض جنس کے فرق سے جذبات و احساسات کیسے بدل جاتے ہیں۔" میں نے یونہی اُس کو بیچ میں ٹوک کر کہہ دیا۔

"بدل جاتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "دوستی پر صنف واضح طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مخالف جنس کے ساتھ دوستی کا وہ پیمانہ اور معیار قائم نہیں رکھا جا سکتا جس کا ہم جنس کے اوپر اطلاق کیا جاتا ہے۔ چھوٹی سی مثال لے لیجئے۔ اپنے ہم جنس دوستوں سے انسان بے تکلفی کی آخری حدود تک بھی پہنچ جاتا ہے' بے لحاظ گفتگو' چھینا جھپٹی' ایک دوسرے کو پیار کرنے کے بے ساختہ اور وارفتہ انداز' ایک دوسرے کی انتہائی قربتیں۔ کیا یہ سب چھیڑ چھاڑ' ہنسی

مذاق مخالف جنس سے تعلق رکھنے والے دوست سے روا رکھی جا سکتی ہیں؟ ہم جنس دوست کا اظہار الفت' لمس اور قربت سے محسوسات اور جذبات نارمل رہتے ہیں' ان میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ پیدا نہیں ہوتا مگر صنف مخالف سے تعلق رکھنے والے دوست کے معاملے میں ایسی بے نیازی اور فارمیلٹی نہیں برتی جا سکتی۔"

وہ سانس لینے کو رکی تھی۔

"مگر کیسے۔" میں دلچسپی سے اُس کے خیالات سے محفوظ ہو رہا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ دونوں ہی فطرت کی کشش سے نجات نہیں پا سکتے۔ لامحالہ جنس بیچ میں آ جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے' سوچتے' بات کرتے اور چھوتے وقت جذبات کے ساگر متلاطم ہو ہی جاتے ہیں۔ ہم جنس کی دوستی کی طرح ٹریٹ منٹ نہیں ہو پاتی۔ مخالف صنف سے تعلق رکھنے والے دو دوست ایک دوسرے کو امتیازی بنیادوں پر محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کو امتیازی بنیادوں پر محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کی عام فہم بات میں بھی معنویت تلاش کرتے ہیں۔ اظہار الفت کے بے تکلف اظہار کو لامحالہ مرد یا عورت کے جذبات و احساسات کے تناظر میں دیکھتا ہے اور اس میں معنی خیزی اور اپنے مطلب کے مفہوم ڈھونڈتا ہے۔ ہم جنس دوستی کی سی بے پروائی اور جذبات کا ٹھہراؤ ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ابتدا میں کچھ عرصے کے لیے وقتی طور پر وہ صنفی کشش سے بالا رہ کر پاکیزہ دوستی قائم کر لیں تو بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مستقل وابستگی اور قربت رنگ لانا شروع کر دیتی ہے۔ کسی نہ کسی موڑ پر مرد اور عورت کے درمیان ازل سے پروان چڑھنے والا فطری جذبہ اپنے وجود کا احساس دلا دیتا ہے۔ اور جب یہ احساس ہو جائے تو پھر دوستی کے رشتے کی پاکیزگی اور قلبی شفافیت خود بخود مجروح ہو جاتی ہیں۔ یوں یہ دوستی اپنا اصل روپ اور رنگ کھو دیتی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان دوستی کے دعوے محض ڈھونگ ہیں' دونوں میں کبھی بھی پاکیزہ دوست تشکیل نہیں پا سکتی اور میں اس قسم کے بودے' سطحی اور کمزور جذبات پر مبنی تعلقات استوار کرنے کی قائل نہیں ہوں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے مرد اور خواتین دوستی کے تعلقات کی گہرائی میں جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ دوستی کے مقدس نام سے قائم ہونے والے یہ بندھن درحقیقت جنسی بھوک اور فطری منہ زور سرکش جذبات کی تسکین حاصل کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ دوستی کی آڑ میں قدرتی نفسانی جذبوں کی تکمیل کی جا رہی ہے۔"

"چلیے مان لیا کہ مرد اور عورت کی دوستی آپ کے نزدیک فحاشی کے زمرے میں آتی ہے مگر یہ

بھی تو ممکن نہیں کہ مرد اور عورت میں صرف اور صرف جنس کا رشتہ ہوتا ہے؟" میں نے اختلاف کیا۔

"میں نے یہ کب کہا۔ مرد باپ ہوتا ہے' بیٹا ہوتا ہے' بھائی ہوتا ہے۔ ہاں مگر اس کے ماسوا وہ صرف اور صرف ایک مرد ہوتا ہے۔" وہ اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے اس کی یہ ادا اچھی لگی۔

"میں باپ اور بیٹے کے کریکٹر پر تو پورا نہیں اُتر سکتا مگر بھائی کا اعزاز تو پا سکتا ہوں نا۔" میں نے بہت چاہت سے اس کے سامنے ہولے سے سر خم کرتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

یکا یک اس کے کھنچے کشیدہ جذبات سے مزین سرد اور سپاٹ چہرے پر خوشی کی رنگین لہریں دوڑ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں منجمد سناٹے جیسے گیت میں بدل گئے۔

"ہاں۔ ضرور۔ تم مجھے ایک بھائی ہی کی طرح عزیز رہو گے۔"

اس کے شدت جذبات سے چور لہجے میں بہنوں والا مان تھا اور اپنائیت تھی۔

میں سرشار ہو گیا۔

"بہن تو بن گئی ہیں' اب میرا مسئلہ حل کیجئے نا۔ کچھ مدد کیجئے میری۔ مگر یاد رہے' ہمدردانہ اور خیر خواہانہ مدد۔" میں آخر میں کچھ شوخ ہو گیا۔

"کریں گے بھئی ضرور کریں گے۔" وہ بیگ سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں کوئٹہ سے واپس آ جاؤں پھر تفصیل سے سارا معاملہ ڈسکس کریں گے۔ تم فی الحال کوئی قدم مت اُٹھانا مجھے بتائے بغیر۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے شرافت سے سر تسلیم خم کیا۔ وہ ہاتھ ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔

مگر یہ عہد پورا نہ ہو سکا۔ اُسی شام کو جب وہ کوئٹہ روانہ ہو چکی تھی' تنزیلہ رحمٰن کا فون آ گیا۔

فون کیا تھا گویا بھونچال آ گیا تھا۔

میں اسی رات عالم جنون میں لاہور روانہ ہو گیا۔

♥ ♥ ♥

یہ کوچہ و بازار میں رُلتی ہوئی' یہ دل کے آتشدانوں میں سلگتی ہوئی' یہ ہر زبان پہ گردش کرتی ہوئی محبت' کیا چیز ہے' یہ محبت۔

وہ شعلہ جو بجھائے نہ بجھے!

ایسا نعرہ جو دبائے نہ دبے!

ایسی صورت جو مٹائے نہ مٹے۔

زمانہ سو شکلیں بدلتا ہے' جذبہ اپنی ماہیت' شدت اور تاثیر نہیں بدل سکا اور نہ کبھی بدلے گا۔ کہ یہ ازل سے "ہست" کے وجود میں ڈھلا ہوا ہے۔ کہیں شعلہ بن کر' کہیں نعرہ اور کہیں پتھر بن کر یہ جذبہ اپنے مزاج کے موسموں سے آشنائی دلاتا رہتا ہے۔ زندگی کا سفر تمام ہو تو ہو' محبت کا سفر تا ابد جاری رہتا ہے۔

محبت کا جذبہ شدتوں کو چھو لے تو یہاں وہاں یہی پکار مچتی ہے کہ دل کے جلتے جنگل میں اس کے پیار کی برکھا اتنی کھل کے برسے کہ ہر سو جل تھل ہو جائے۔ تشنگی کی ہر رگ سیراب ہو جائے۔ طلب کی جھولی بھر جائے اور پیاس سیری کی منزل پا لے۔

مجھے بھی انہی شدتوں نے نڈھال کیا تھا مگر میرے نصیب میں وصال کے موسم تحریر نہیں تھے۔ ناکام و نامراد اس شہر بے درد سے چلا آیا تھا کہ میں اس کو کسی اور کا ہوتے دیکھنے کا یارا نہیں رکھتا تھا۔ اسلام آباد آیا تو ہر پل یہی خوش گمانی رہی کہ لوح تقدیر بدل جائے گی۔ اچانک کہیں پر کوئی حادثہ جمال احمد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور میری تنزیلہ مجھے واپس مل جائے گی۔ وہ میری ہو جائے گی۔ ابھی تک دل یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ میری نہیں رہی۔ مگر میری ان خوش فہمیوں کا قلع قمع بڑے اہتمام سے ہو گیا' جب تنزیلہ نے فون پر بتایا کہ کل اُس کی شادی ہے۔ صورت حال سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی ہوئے حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ دل پر رکھی ہوئی صبر و ضبط کی بھاری سل لمحوں میں سرک گئی۔

میرے کانوں نے صرف اس کی سسکتی ہوئی بھرائی بے بس آواز سنی تھی۔

''تحریم۔کل اس وقت میں تمہاری نہیں رہوں گی۔تم سے بہت دور چلی جاؤں گی۔''

''میں ۔ میں آرہا ہوں ابھی۔'' میں نے جذبات کی شدت سے سرخ انگارا اپنے چہرے سمیت لرزتے ہوئے ہیجان خیز لہجے میں کہہ کر فون رکھا اور نتائج وعواقب سے بے پرواہ ہو کر کوچ میں سوار ہو گیا۔

اس وقت میں راستے میں تھا۔رات کے دس بج رہے تھے اور ابھی مزید تین گھنٹے کا سفر باقی تھا۔میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر لاہور پہنچ جاؤں۔

''کاش کوچ کسی طرح ہیلی کاپٹر میں بدل جائے اور میں لمحوں میں لاہور جا پہنچوں۔'' میں نے احمقانہ انداز میں سوچا۔پھر یونہی اکتائی ہوئی نظروں سے اپنے برابر بیٹھے نوجوان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شکل وصورت سے وہ کوئی طالب علم ہی لگتا تھا۔اس کے چہرے پر سیاہ گھنی داڑھی اور سر پر رکھی سفید ٹوپی اس بات کی دلالت کر رہی تھی کہ اُس کا تعلق ضرور کسی دینی تحریک سے ہو گا۔اس کی گود میں افغان جہاد سے متعلق کچھ میگزین رکھے ہوئے تھے جن میں سے وہ ایک کو کھول کر اُس کا مطالعہ کر رہا تھا۔میں نے بیزار سا ہو کر یہ مشغلہ ترک کر دیا اور کھڑکی کے شیشے سرکا کر باہر سیاہ آسمان پر چمکتے ستاروں پر نظر جما دی۔

''تیرہ بخت دنیا کے آسمان پر جاگتے یہ ستارے وہ بھی دیکھ رہی ہو گی۔''

یکایک مجھے ان ستاروں پر پیار آنے لگا۔یہ ستارے وہ جو میر محبوب کی آنکھوں کو سرفراز کر رہے ہیں۔جو اُس چشم ساحر میں روشن ہوں گے۔جو اُس کے سراپے کو جگمگا رہے ہوں گے۔میری سوچیں کہیں اور اُڑان بھرنے لگیں۔

یہ جھلملاتے ٹمٹماتے ستارے صدیوں سے ہزاروں دلوں میں آس وامید کے بجھتے چراغوں میں تیل ڈالنے کا سبب رہے ہیں۔

تھکے ہارے قافلے انہیں خفیہ راہ جانتے ہیں۔جنہیں نازنینیں گلے کا ہار بنانے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔

جنہیں عاشق فلک سے توڑ کر اپنے محبوب کی راہوں میں بچھانے کے جتن کرتے ہیں۔

اور عروسِ نو کی سیج پر سجانے کی حسرت رکھتے ہیں۔

ابتصار بھائی پہلے پہل اچھے خاصے خفا ہوئے تھے۔

''عجیب آدمی ہو تم۔پندرہ دن بھی نہیں گزرے اور تم جاب چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے، کوئی اتا پتا نہیں دیا۔اب یہ نہ ہو دوبارہ تمہیں جن چڑھ جائے۔بار بار تو نوکریاں نہیں ملتیں نا۔مجھے سر کے سامنے اب کے شرمندہ نہ کروانا۔''

اُن کے لہجے میں اب کے خاصی سنجیدگی تھی۔میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ہر چند کہ دل میں تلملا رہا تھا۔اگر یہ جاب میری ضرورت نہ ہوتی تو ٹھوکر مار کے چل دیتا۔فی الوقت اور کوئی جاب نظر میں نہیں تھی اس لیے ابتصار بھائی سے کہنا پڑا تھا۔میری سابقہ ڈیوٹی بحال کر دی گئی تھی۔اب کے میں سنجیدگی سے جاب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔اس لیے شروع دن سے ہی پوری توجہ سے کمپیوٹر ورک شروع کر دیا۔

مگر نجانے کیا بات تھی ہزار کوشش کے باوجود دھیان بٹ جاتا تھا۔شکستہ دل نے اتنا چور چور کر دیا تھا کہ خواب بھی روٹھ گئے تھے اور جو کبھی آتے تو ان میں تشنگی سے سلگتی ریت، چیختی آندھیاں، رُتوں کا قہر اور شکست کے اذیت ناک سائے رقص کرتے نظر آتے تھے۔بقول منیر نیازی کے میری حالت کچھ کچھ یوں تھی کہ

وہ بے حسی ہے مسلسل شکستِ دل سے منیر
کوئی بچھڑ کے چلا جائے غم نہیں ہوتا

زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار دی تھی۔اب تو یوں لگتا تھا، جان بھی چلی جائے تو کچھ غم نہیں ہو گا۔اب لٹانے کو کچھ بھی تو نہ رہا تھا۔

زندگی کی سب سے بڑی خوشی روٹھ گئی تھی۔

اس کے مقابلے میں چاند سورج بھی مل جائے تو کیا فرق پڑتا تھا۔کسی زمانے میں ایک گانا

جیسے گھٹن اور حبس سے دم نکلا جا رہا ہو۔

"بھائی صاحب۔ خیریت ہے نا؟ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔" میری دھونکنی کی طرح چلتی سانس، پسینے میں نہایا ہوا نڈھال چہرا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں ادھر اُدھر ڈولتا جسم میرے برابر بیٹھے داڑھی والے نوجوان کو چونکا گیا تھا۔ وہ آہستگی سے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تشویش ناک انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

"پانی پلا دینا بھائی" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں بمشکل اس کی فلاسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے جھٹ گلاس میں پانی نکال کر مجھے تھما دیا پھر آہستہ آہستہ ہاتھ سہلانے لگا۔ اپنے رومال سے میرے ماتھے پر پھوٹتا پسینہ صاف کرنے لگ۔ اس کے انداز میں اپنائیت اور فکر مندی تھی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کچھ روز آرام کر لیتے۔ اس حالت میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوتا" اس نے ازراہ ہمدردی شائستگی سے کہا۔ "یا کسی کو ساتھ لے لیتے۔"

میری حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

"شریک سفر ملے نہ ملے سفر تو شرط ہے ناں" میں خالی خالی نظروں سے باہر دیکھتا ہوا آہستگی سے بولا۔ "کچھ سفر انسان کو اکیلے ہی طے کرنے پڑتے ہیں۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔"

اب کے اس نے بڑے غور سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔

"آپ نے مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور میں محسوس کر رہا ہوں، جیسے یہ رشتہ میرے اور آپ کے درمیان مدتوں پہلے قائم ہو چکا ہے۔ مجھے بتائیں گے کیا پریشانی ہے آپ کو۔ بہت ٹوٹے ہوئے لگ رہے ہیں آپ" اس کے انداز میں خلوص اور خیر خواہی کے جذبات نمایاں تھے۔

"جن کی کوئی منزل نہ ہو وہ بے سمت مسافر اسی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ کہیں راہ میں اجل کو پیارے ہو جاتے ہیں اور کہیں منزلوں کے آس پاس بھٹکتے ہوئے تلاش کے دائرے

میں چکراتے نڈھال ہو کر پتی پتی ہو کر بکھر جاتے ہیں۔"

میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ خود کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ شکستگی اور تشنگی کے زہریلے ناگ مجھے پل پل ڈس رہے تھے۔

"یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ناکام، محروم، نامراد دکھوں سے اٹی ہوئی!! وقت کا طالع کب کرم کرے گا!!!!"

"ایک منزل کھو جانے سے زندگی کا اختتام نہیں ہو جاتا بھائی صاحب۔ وہ اپنے علامہ محمد اقبال کہتے ہیں نا کہ

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

اور یہ بھی کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

میں دل گیر سے انداز میں ہنس پڑا۔

"جانے کون کون سے امتحان عشق دے چکا ہوں محترم مگر ہر بار فیل ہونا ہی مقدر ٹھہرا۔"

"میرا نام محمد طارق حسن ہے۔ میں سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔ کابل سے آیا ہوں، اپنے گھر والوں سے ملنے کے بعد پرسوں دوبارہ کابل چلا جاؤں گا۔"

وہ اپنے متعلق بتانے لگا۔ اس کا تعلق مجاہدین کی ایک تحریک سے تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی وہ تحریک میں شامل ہو گیا تھا اور جوش شہادت اُسے افغانستان کے خارزاروں میں لے آیا تھا۔ ان دنوں افغانستان میں خانہ جنگی کی سی کیفیت تھی۔

میں نے بھی اسے اپنے متعلق تفصیل سے بتایا۔ کچھ ہی دیر میں ہم گھل مل گئے تھے۔

"تحریم بھائی، میرے پاس آپ کے لیے ایک تجویز ہے اگر آپ کے دل کو لگے تو ضرور عمل

کیجئے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ابھی آپ میرے ساتھ سیالکوٹ چلیں' میرے گھر میں قیام کریں اور پرسوں ہم دونوں افغانستان کی طرف عازم سفر ہو جائیں گے۔ وہاں آپ مجاہدین سے ملئے گا۔ ہمارے کمانڈر صاحب آپ کی تربیت کریں گے۔ آپ دیکھئے گا جب آپ اپنے جوش و جذبے کو امام بنا کر دشمنوں کی فوج سے برسرِپیکار ہوں گے تو خود بخود زندگی کا اصل مقصد اور حقیقی روح آپ پر کھل جائے گی۔ آپ کی وحشتیں سکون پا جائیں گی۔''

طارق حسن کی تجویز مجھے اچھی لگی۔ اب آزما کے یہ ہنر بھی دیکھتے ہیں۔ دل وحشی کو بہلانے کا یہ طریقہ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔

یوں بھی اب میری حیثیت دیارِ خواب کی گلیوں میں رلتے پھرتے ایک بے مایہ تنکے کی سی تھی۔

پانی کو ہمیشہ پیاس بلاتی ہے میری وحشتوں اور جنوں خیزیوں کو بھی شاید افغانستان کے کوہ دمن آواز دے رہے تھے۔

اور پھر میں نے اس آواز پر لبیک کہہ دیا۔

ہمیں کس ہاتھ کی محبوب ریکھاؤں میں رہنا تھا۔
کس دل میں اترنا تھا۔
چمکنا تھا کن آنکھوں میں۔
کہاں پر پھول بننا تھا۔
اور کب خوشبو کی صورت کوئے جاناں سے گزرنا تھا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔
ہمیں کس قریہ آب و ہوا کے سنگ چلنا تھا۔
کہاں شامیں گزرنا تھیں
کہاں مہتاب راتوں میں کسی کو یاد کرنا تھا۔
کسی کو بھول جانا تھا۔
کہاں پر صبح کا آغاز کرنا تھا۔
کہاں سورج نکلنا تھا۔
سفر کے دشت میں تھکے مارے مسافر کو کہاں خیمہ لگانا تھا۔
کہاں دریا میں کشتی ڈالنا تھی۔
اور کس ساحل اترنا تھا۔
سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔
ہمیں کس قریہ آب و ہوا کے سنگ رہنا تھا۔

''تنزیلہ۔ تنزیلہ مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے' کوئی کام ہونے ہی والا ہوتا ہے' محنت کا صلہ ملنے والا ہوتا ہے۔ جدائی کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہوتی ہیں' محبوب ملنے ہی والا ہوتا ہے۔ مگر نہیں ملتا۔ خوشی سے بھرا ہوا دل اداسی سے بھر جاتا ہے اور ختم ہو جانے والا سفر ایک بار پھر شروع ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے تنزیلہ' بتائیے ناں مجھے۔''

نبیل کے نازک براؤن شیشے کی سطح پر سر ٹکا کے میں بے اختیار رو دیا تھا۔

آج پانچ ماہ بعد ایک مدت کی خواری کے بعد تھک ہار کے پھر اسی مہربان ہستی کے روبرو تھا۔ تھکے ٹوٹے شکستہ قدم ڈگمگاتے ہوئے تھک گئے تو پڑاؤ ڈالنے کے لیے لامحالہ تنزیلہ اکرام کا دھیان دل میں آیا تھا۔ سارے زمانے میں وہی ایک ہمدرد اور خیر خواہ وجود تھا جو میری لیر لیر داستان زندگی کو تحمل اور تدبر سے سن کر کوئی مناسب راستہ بتا سکتا تھا۔

''کہاں تھے تم اتنے عرصے سے؟ میں نے کہا بھی تھا' مجھے بتائے بغیر کہیں مت جانا۔ پھر یہ وعدہ خلافی کیوں کی۔ خبر ہے' میں کتنا عرصہ پریشان رہی ہوں۔ کم از کم اتا پتا ہی بتا جاتے۔ یوں اچانک چل دیئے۔'' وہ بہت خفا ہو رہی تھی مگر اس خفگی میں اپنائیت اور تعلق کا مان شامل تھا۔ ''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟'' اس نے دکھ چھلکاتی نظروں سے میری حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کسی قدر بے بسی سے سوال کیا۔

ملگجے غبار آلود کپڑے' بڑھی ہوئی شیو' بے ترتیب الجھے ہوئے بال' بجھی بجھی آنکھیں' کھنڈر ویران چہرہ۔ میری حالت واقعی کسی سنسان مقبرے کی سی ہو رہی تھی۔

''میں کابل چلا گیا تھا مرنے کے۔'' میں نے سر جھکا کر ندامت سے کہا۔ وہ جس دلسوزی اور تردد سے میری اچانک گمشدگی کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی' اس نے سچ مچ مجھے شرمسار کر دیا۔ اپنے جنون میں' میں بھول ہی بیٹھا تھا کہ ابھی اس دنیا میں میری پروا کرنے والا ایک گداز دل موجود ہے۔ مجھے روانگی سے پہلے اسے بتا دینا چاہیے تھا۔

''اس جان کی اب اور تو کسی کو ضرورت نہیں رہی تھی سوچا' خدا کی راہ میں ہی قربان کر دوں۔ مگر افسوس وہاں بھی قبولیت نہ ہوئی۔''

میرے لہجے میں تلخ و ترش حقائق کی آنچ آ رہی تھی۔ میں بہت آہستہ آواز میں رک رک کے جملے مکمل کر رہا تھا۔ بہ آواز بلند بولنے کی نہ ہمت رہی تھی اور نہ خواہش۔

''کس کو سناتا دل کی آواز' جب اس مالک کائنات نے نہ سنی تھی۔'' ''بہت دفعہ موت کے منہ میں پہنچا مگر وہ نادیدہ طاقت مجھے ہر بار بچا کے واپس لے آتی تھی حالانکہ میں مرنا چاہتا تھا۔ میرے لیے جینے کا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ میں نے کیا کرنا ہے جی کر۔ مگر موت نے بھی مجھے قبول نہیں کیا۔ تین ماہ بعد واپس آ گیا اور مختلف شہروں میں پھرتا پھراتا رہا۔ جہاں رات پڑی' زمین پر سو گیا۔ جو روکھی سوکھی ملی کھا لی۔ خواہش نہ ہو تو آسائش کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ کبھی وہ زمانہ تھا' میں اپنے

کمرے میں کسی کی بلا اجازت آمد پر طوفان اٹھا دیا کرتا تھا۔ بہت سے بہتر...... کپڑے پہنتا مگر پھر بھی ہر لباس میں کیڑے نکالتا رہتا۔ امپورٹڈ سوپ سے نہانے والے کی یہ حالت ہو گئی کہ کئی کئی ہفتے بغیر نہائے گزر جاتے رہے۔ میرے استعمال کی چیز صرف میں ہی استعمال کر سکتا تھا' کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ نفاست پسند مزاج دار اور نخرے کرنے والا تھا کہ اپنی ضرورت کی چیز پر کسی دوسرے کی نگاہ بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا مگر اب کے اس عالم میں بسر ہوئی کہ تن کے لباس اور پیٹ کی بھوک کا کچھ احساس باقی نہیں رہا تھا۔ گلی گلی پھرتا رہا۔ جانے کس تلاش میں۔ کس کی طلب میں۔ کسی دیوانگی میں حال سے بے حال ہوتا رہا۔ جب در در کی خاک چھان کر تھک گیا۔ جنوں کی آگ کچھ مدھم پڑی تو آپ کے پاس آ گیا۔''

میں نے تھک کر کرسی سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں موند لیں۔ تھکن کا احساس پلکوں کی جڑیں چھو رہا تھا۔ سانس لینے سے بھی تکان اتر آتی تھی وجود میں۔

''اتنا تھک گیا ہوں کہ اب مرنا چاہتا ہوں مگر موت بھی مجھ سے روٹھی ہوئی ہے۔ میں کیا کروں تنزیلہ۔'' میرے لہجے میں بیچارگی تھی۔

وہ چپ چاپ متاسف نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میرا کچھ گم ہو گیا ہے جواب مجھے نہیں ملتا۔'' میں آنکھیں بند کیے کیے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

''اور نہ ملے گا۔'' بڑی دیر کے بعد اس نے زبان کھولی۔ ''ہر گمشدہ چیز اسی جگہ سے مل جاتی ہے جہاں سے گم ہوئی ہو' ما سوائے محبت کے۔ محبت ایک بار کھو جائے تو دوبارہ نہیں ملتی۔ تم اپنی ذات کے جنگل کی آگ سے راکھ کیوں کریدتے ہو۔ تم بھول جاؤ اور بھلا دو اس کو اور اس کی یادوں کو۔ سمجھو وہ ایک سراب تھی۔ ایک ایسا وعدہ جسے کبھی ایفا نہ ہونا تھا۔''

جواب میں بے ساختہ ہی میرے لبوں سے شعر پھسل پڑا۔

میں اسے عہد شکن کیسے سمجھ لوں جس نے
آخری خط میں یہ لکھا تھا فقط آپ کی دوست

اس کے خطوں کا ایک ایک حرف اس کی محبت کی سچائی کا گواہ ہے۔ اس کی گفٹ کی ہوئی کیسٹوں کا ہر ہر گیت اس کے جذبوں کی کہانیاں سناتا ہے' اس کے سنگ بیتے ایک ایک [illegible]

مجھے چھو کر اس کے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ میں اسے کیسے بھول جاؤں تنزیلہ۔" سر کو بے کلی سے ادھر اُدھر پٹختے ہوئے میری نگاہ میں اُس کا سراپا جگمگانے لگا۔

اس کا خیال ہی اتنا نشہ آور تھا کہ ہولے ہولے میری بے چینیوں کو قرار آنے لگا۔ اضطراب کی لہریں سکون کے ساحلوں سے آشنا ہونے لگیں۔

"آپ کو پتا ہے تنزیلہ' وہ کیسی ہے۔" میں از خود رفتگی کے عالم میں تنزیلہ کے پیچھے موجود دیوار کے کسی غیر مرئی نقطے پہ اُس کی تصور تراشتے ہوئے مخمور سے دھیمے دھیمے لہجے میں مخاطب تھا۔

"اس کی آنکھ کے جزیرے میں میرے دل کی دنیا آباد ہے۔ اس کے چراغ جیسے بدن کی لو میں میری خواہشوں کی تصویریں رقص کرتی ہیں۔ اس کی بند مٹھی میں چاہتوں کا ہیرا جگمگاتا ہے۔ اس کے دل کے کھلے سمندر میں میرے نام کی لہریں سانس لیتی ہیں۔"

"تحریم۔ ہوش کی دوا کرو۔ پلیز۔" اس کی بے انتہا متوحش بدحواس پکار مجھے جھنجھوڑنے لگی۔ وہ میرے دیوانہ پن سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"ہوں۔ میں ہوش میں ہوں تنزیلہ" میں نے چونک کر ہارے ہوئے شکستہ انداز میں اسے یقین دلایا۔ "اب مجھے کیا ہونا ہے۔ بڑی ڈھیٹ ہے میری کھال۔" میں برگشتہ ہو کر کہہ رہا تھا۔" اور تو سب اپنی جگہ ہے مگر ایک سلسلہ ہے دل کا جو بحال ہونے میں نہیں آ رہا۔ ایک زخم ہے جگر کا جو بھر کے نہیں دے رہا۔"

"لگتا ہے تمہارا ذہن مدتوں سے جاگتا رہا ہے۔ اسی لیے تمہارے اعصاب متاثر ہوئے ہیں۔ تمہیں ذہنی و جسمانی آرام کی ضرورت ہے تحریم۔" تنزیلہ کی نظر میں میرے لیے ترحم' تردد اور تشویش کے جذبات نمایاں تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اب سکت بھی نہیں رہی تھی۔

♥♥♥

جنہیں شاعر اپنے طائر خیال میں سمونے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

جنہیں نغمہ گر اپنی تانوں میں شامل کر کے انہیں لاہوتی رنگ دینا چاہتے ہیں۔

جو محبوب کو ملانے والی راہ میں چراغ بن کر جگمگاتے ہیں اور راستہ دکھاتے ہیں۔

جو جدائی کی طویل راتوں کی اذیت ناک گھڑیاں بسر کرنے کے لیے صرف ایک مصروفیت کا کام دیتے ہیں۔ عاشق تارے گن گن کر رات گزار لیتا ہے۔

غرضیکہ یہ ستارے کسی نہ کسی روپ میں انسان کے ہمنوا اور خیر کواہ رہے ہیں۔

آج سے نہیں برسوں سے۔ ہمیشہ سے۔ اور شاید ہمیشہ رہیں گے۔

"وقت کیوں نہیں بیت رہا؟" میں نے بہت بے چین ہو کر مٹھیاں بھینچ کر بے بسی سے سوچا تھا۔

"آخر میں کس واسطے لاہور بھاگا جا رہا ہوں۔ کیا کرنے جا رہا ہوں۔ کیا کر لوں گا وہاں جا کر؟"

معاً ایک تیز نکیلا حقیقت پسندانہ استفسار دماغ کے کونے کھدرے سے برآمد ہوا اور ذہن میں ہلچل مچانے لگا۔

"واقعی۔ میں کیوں دیوانہ وار چل پڑا ہوں؟ میں جیسے ایک ساعت میں ہوش میں آ گیا۔

"اُس کی شادی طے تھی اور کچھ عرصے بعد ہونا ہی تھی۔ اس بات کی مجھے اچھی طرح خبر تھی۔ یہ ساعت تو آنی ہی تھی پھر کیوں اس دیوانگی میں اس کی شادی کی خبر سن کر دوڑا جا رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ کل وہ یہاں سے بہت دور چلی جائے گی۔ اور دل یوں دھڑکا جیسے اسی لمحے دھڑک کر بند ہو جائے گا اگر میں لاہور نہ گیا تو۔ مگر ایسا کیوں ہوا۔ جب میں اس حقیقت کو قبول کر چکا ہوں تو پھر یہ جنون چہ معنی دارد۔" مجھے اپنی وحشتوں پر ملال ہونے لگا۔

"بھلا کیا کرنے جا رہا تھا میں۔ کیا وہاں جا کر شادی رکوا لوں گا؟"

"کوئی معجزہ ہو گا کہ کل تنزیلہ جمال احمد کی بجائے میرے نام کر دی جائے گی!! میں کس برتے پر نکل بھاگا ہوں!!!"

میرے اندر صدیوں کی تھکن برف کے گالوں کی طرح گرنے لگی۔ ایک چھلنی کر دینے والا بے کل احساس میرے رگ و پے میں کانچ بکھیرنے لگا۔

یوں لگا جیسے ارد گرد کے ہر منظر پر دھند چھا گئی ہو۔ میں بے اختیار لمبی لمبی سانسیں لینے لگا'

سنا کرتا تھا جو کچھ ایسے ہی جذبات کا ترجمان تھا کہ

ایک تو نہ ملا' ساری دنیا ملے بھی تو کیا ہے
میرا دل نہ کھلا' ساری بگیا کھلے بھی تو کیا ہے

اس وقت تو معانی مفہوم سے قطع نظر یونہی سرسری سے انداز میں سن کر فراموش کر دیا تھا مگر اب اس کا حرف حرف سچا لگ رہا تھا۔ خود پر بیت جو رہی تھی۔ جب تک اپنا دل زخم سے آشنا نہ ہو' کسی کا درد دل کب سمجھ میں آتا ہے۔

تنزیلہ اکرام نے ایسے کٹھن لمحات میں میرا بہت ساتھ دیا تھا۔

میں دل پہ گزرتی کیفیات اُس سے شیئر کرتا تھا۔ وہ بوریت کا تاثر دیئے بغیر دلچسپی سے سنتی رہتی۔ بیچ میں کہیں اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں ٹوک کر ناصحانہ لہجے میں مجھے سمجھاتی رہتی تھی۔

ایک بات میں نے ان چند دنوں میں خصوصیت سے نوٹ کی کہ انتصار بھائی اکثر و بیشتر کمپیوٹر روم کا چکر لگا کر مجھے چیک کرنے لگے تھے۔ آفس میں بہت سی خواتین کام کرتی تھیں اور کمپیوٹر کام کروانے کی غرض سے گاہے بگاہے کمپیوٹر روم آتی رہتی تھیں۔ انتصار بھائی کے ''راؤنڈ'' کے دوران اگر کوئی خاتون کمرے میں موجود ہوتیں تو انتصار بھائی کے چہرے سے ناگواری چھلکنے لگتی تھی۔ خصوصاً تنزیلہ کی طویل موجودگی انہیں خاصی گراں گزرتی تھی۔ میں نے بارہا اُن کی چبھتی ہوئی نگاہیں خود پر اور تنزیلہ پر مرکوز ہوتی محسوس کی تھیں۔

''دراصل انتصار صاحب یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ آفس میں افسران اور کام کرنے والی خواتین کی توجہ اور نگاہ کرم اُن کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف مائل ہو۔ وہ یہاں کام کرنے والی ہر لڑکی پر اپنا پورا پورا حق سمجھتے ہیں کہ وہ ان کو لبھائے' رجھائے اور صرف انہی کے جال میں پھڑپھڑائے۔ کسی دوسرے کے دام میں گرفتار ہوتے دیکھنا اُنکی بھرپور پرکشش شخصیت کی توہین کے مترادف ہے۔ اسی لیے انگارے چباتے ہیں۔''

اپنی اُلجھن کا دبے لفظوں میں تنزیلہ سے تذکرہ کیا تو اس نے بڑے آرام سے انتصار بھائی کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا۔

''مگر آپ کی ذات تو اس زمرے میں نہیں آتی پھر آپ سے کیوں خائف رہتے ہیں۔''

مجھے تعجب تھا' تنزیلہ جیسی سوبر اور میچور خاتون کے بارے میں تو انہیں شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ مجھ سے بڑی تھی پھر مزاج و کردار کے معاملے میں آئینہ تھی اور یہ بات پورا

آفس جانتا تھا۔ وہ خود بھی اُس کے ٹھوس' مضبوط اور پختہ چال چلن کے گواہ تھے۔ وہ تو سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ رکھتی تھی محتاط' ہمدردانہ اور بردبار سا۔ وہ کسی سے کیا انوالو ہو سکتی تھی۔

''جنس کا مارا شخص اخلاقی اقدار و قواعد سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ جس طرح ایک بھوکے کو چاند بھی گول چپاتی کی طرح دکھائی دیتا ہے' اسی طرح ہوس پرست بندے کو ہر نسوانی وجود میں اپنے نفس کی تسکین کے سامان نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹی بڑی' جائز ناجائز اور اچھی بُری کی تمیز کے بغیر صرف ہوس کی آگ بجھانے کی راہ ڈھونڈتا ہے اور اپنی طرح دوسروں کو بھی ایسا ہی خیال کرتا ہے۔ جس طرح وہ خود رشتے اور اخلاقیات کی قدروں کو دھیان میں رکھے بغیر نقطۂ سیرابی تک پہنچنے کی تدبیر کرتا ہے' اسی قانون کا وہ دوسروں پر بھی اطلاق کرتا ہے۔ دراصل ہم لوگ جیسے خود ہوتے ہیں' ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ ایک نیک دل انسان ہر دوسرے بندے کو با اعتبار اور نیک سمجھ کر اُس پر بھروسا کر لیتا ہے۔ بعد میں چاہے اس کو دھوکہ ہی ملے مگر وہ تازندگی دوسروں کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتا رہے گا' جب کہ ایک شیطان صفت' اُتھلے خیالات کا مالک اپنی ذات کے عیوب دوسروں میں ڈھونڈتا پھرے گا۔ جیسا وہ خود نفس پرست اور خود غرض ہوتا ہے' ویسا ہی دوسروں کو خیال کرتا ہے۔'' میں اُس کے چہرے کو بغور دیکھتا ہوا یونہی چپ سا ہو گیا اور پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گیا۔

''تحریم۔ میرا خیال ہے' تم کچھ روز کے لیے لاہور اپنے گھر سے ہو آؤ۔'' اُس نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے اچانک کہا۔

میں تلخی سے مسکرایا۔ ''وہاں کون میرا منتظر بیٹھا ہو گا۔ وہ لوگ تو اپنے طور پر مجھے رو بھی چکے ہوں گے۔''

''بُری بات۔ جذبوں کا اس طرح مذاق نہیں بناتے۔'' اس نے فہمائشی نظروں سے گھورا' تمہاری امی' تمہارے ابا جی' تمہارے بہن بھائی تمہارے منتظر ہوں گے۔ کتنی ہی بار تمہاری گمشدگی کے زمانے میں لاہور سے اُن کا فون آتا رہا ہے' انتصار صاحب کے پاس۔ تم انہیں اپنی واپسی کی اطلاع دو۔ جانے کتنے پریشان ہوں گے تمہارے لیے۔''

''کوئی بھی پریشان نہیں ہو گا۔''

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر بے ساختگی کے لمحوں میں امی کا متفکر و ملول چہرہ میری نگاہ میں پھرنے لگا۔

دنیا کے ہر رشتے سے نگاہ چرائی جاسکتی ہے مگر ماں کی ممتا کا بندھن ایسا اٹوٹ اور پرتاثیر ہوتا ہے کہ اس سے رہائی ممکن نہیں ہوتی۔

شاید اس لیے کہ یہی وہ واحد رشتہ ہے' دنیا میں جو بے غرض ہوتا ہے۔ جس کی طلب فقط اولاد کے چہرے سے پھوٹتی خوشیوں تک محدود ہوتی ہے۔

یکا یک میرے دل کا پتھر پگھلنے لگا۔

ممتا کی پرحرارت آغوش مجھے بلانے لگی۔

وہ شفیق مہک مجھے پکارنے لگی۔

وہ محبت بھرا آنچل میری تھکن کو آواز دینے لگا۔

میں تنزیلہ کی بات مان کر انتصار سے چند روز کی چھٹی لے تنزیلہ کو بتا کر لاہور چلا آیا۔

♥ ♥ ♥

''گھر سے باہر نکلنے کا راستہ جو آ گیا تھا نواب صاحب کو۔ ہاتھ میں ماں بن مانگے کرارے سرخ سبز نوٹ تھما دیتی تھی۔ اسی زعم میں چل نکلے حضرت' جدھر دل کیا۔ یہاں پیچھے ماں باپ کس طرح مرتے کھپتے ہیں' اس کی جانے جوتی۔ بہت خوددار اور غیرت مند بنے پھرتے ہیں عالی حضرت۔ میں پوچھتا ہوں' کون سی نئی دنیا فتح کر آئے ان چھ ماہ میں' کون سا پہاڑ ڈھایا ہے اس عرصے میں!! فقط ہم کو پریشان کرنا مقصود تھا اور کون سی گورنری کے لیے نکل بھاگا تھا تمہارا لاڈلا۔''

ابا جی کے لہجے میں آج بھی وہی بے رحمی اور سختی تھی۔ ''اللہ کا واسطہ ہے' آپ تو چپ کریں۔ چھ ماہ بعد شکل دکھائی ہے میرے بچے نے۔ میں تو رو رو کے آدھی ہو گئی تھی' تیرے لیے۔ کیسا پتھر بنا لیا تھا تو نے اپنے کلیجے کو۔'' امی مجھے آغوش میں بھر کے رو دیں۔

''بزرگوں کے فیصلے نامنظور ہوں تو کیا گھر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ تم کچھ بتا سمجھا کر تو جاتے۔'' سیما آپا الگ آنسو بہا رہی تھیں۔

میں گم صم سا بیٹھا ان مانوس در و دیوار کو دیکھ رہا تھا جہاں میرا بچپن بیتا تھا۔ جہاں جوانی کے ہنگامہ پرور دور کا آغاز ہوا تھا۔ اس فضا کی اپنی ایک باس تھی۔ وہی مخصوص میک اب بھی یہاں وہاں پھوٹتی مشامِ جاں تک پہنچ رہی تھی۔ کون کیا کہہ رہا تھا۔ کون لتاڑ رہا تھا اور کس کی پروا نہیں رہی تھی۔

مجھے کون سا یہاں رہنا تھا۔ چند روز کی تو بات تھی۔ ممتا کا سونا آنگن دید کے پھولوں سے مہکانا تھا اور بس۔ پھر واپس اسلام آباد چلے جانا تھا۔

مجھ پر کسی کے ردِعمل کا کچھ اثر نہیں تھا۔

''ان دنوں تیرے اکبر تایا سے ہماری کشمکش۔ چل رہی ہے۔ ہم نے سیما کے لیے انتصار کے

رشتے کی بات کی تھی مگر اُدھر سے ٹال مٹول ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں' ہمارا بیٹا نہیں مانتا۔ وہ کسی بڑے آدمی کی بیٹی بیاہنے کے چکر میں ہے۔ ماں باپ کی اشیرباد بھی حاصل ہے۔ ظاہر ہے' کسی وزیر مشیر سے رشتہ جوڑ کر شہر میں قد کاٹھ اور اثر و رسوخ بڑھانا چاہتے ہوں گے۔ اگر یہ رشتہ نہ ہوا تو پوری برادری اُن کا بائیکاٹ کر دے گی۔ لاکر تو دیکھیں غیروں سے بہو۔ پوری برادری ہمارے ساتھ ہے۔ وہ باپ بیٹا کیا کریں گے۔''

امی نے انکشاف پر میں متحیر سا رہ گیا۔

انتصار بھائی اور اکبر تایا کے بدلے بدلے رویے تو میں کچھ روز سے بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ گو کہ ان کے گھر والوں نے بھرپور پذیرائی کی تھی مگر اب کے پہلی والی گرمجوشی' چاہت اور وسعت قلبی شامل نہیں تھی۔ کچھ سناٹا سناٹا چپ چاپ سا گریزپا انداز تعاقبات کرنے کا۔

گھر والوں کے برعکس مجھے کم از کم اس خبر نے خاصا سکون پہنچایا۔

انتصار بھائی جیسا شخص اس قابل تھا بھی نہیں کہ وہ سیما آپا کی زندگی کا ساتھی بنتا۔ یہ تو محض ابا جی لوگ کی ضد تھی کی اپنی لڑکی غیر خاندان میں نہیں دینی۔ البتہ باہر سے لڑکیاں اپنے خاندان میں شامل کی جا سکتی تھیں۔

میرا کمرہ جھٹ پٹ ہاجراں نے صاف ستھرا کر دیا تھا۔

ایک مدت بعد دوبارہ سے آسائشات زندگی سے آشنا ہوا تھا۔ اتنی مدت کے دربدری نے جیسے جسم و جاں کو تقاضوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

میں اگلے روز ہی پلٹ جانا چاہتا تھا مگر امی نے جانے نہیں دیا۔

ایک دن آرام کرنے کے بعد اگلے روز میں شہر کا چکر لگانے کے لیے چل نکلا۔ پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔

آوارہ گردی کرتے ہوئے میں رحمن انڈسٹریز کے قریب سے گزرا تو ایک کاٹ دینے والا نکیلا احساس دل کے زخموں کو جگاتا چلا گیا۔

سیٹھ رحمن' تنزیلہ رحمن کا باپ۔ میری آرزوؤں کا قاتل۔ میرے دل کی سرحدوں پہ شب خون مارنے والا۔ کس قدر بے دردی اور سفاکی سے مجھے ٹھکرا کے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی امنگوں کا خون کیا تھا۔

ایک دن میں اتنا بلند و بالا بن کر تمہارے سامنے آؤں گا ظالم بڈھے کہ تم خود میرے سرنگوں

میں جھک کر اپنی بیٹی مجھے دان کرو گے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تحریم کیا چیز ہے۔ تم نے اُسے ٹھکرا کے دراصل اپنی بدبختی پر مہر ثبت کی تھی۔''

میں اپنی انا' خودداری اور عزت نفس پر تنزیلہ کے باپ کے ہاتھوں پڑنے والی ضرب کی شدت نئے سرے سے اپنے روئیں روئیں میں محسوس کرنے لگا تھا اور منتقمانہ حس سے مغلوب ہو کر انجینئرنگ یونیورسٹی بھی گیا۔ اِدھر اُدھر جتنی دیر پھرتا رہا' دل میں اُداسی اور بے چینی کے پیڑ اُگتے گئے۔

رہ رہ کر ستم گر رہزن دین و ایمان یاد آتی رہی۔

ایک ایک منظر اُس کے وجود کا حساس دلا رہا تھا۔

میرا دل اس سے ملنے کو' اسے دیکھنے کو' اسے نگاہ و دل میں جذب کرنے کو مچلنے لگا۔

کاش' یہیں کہیں پھولوں کی باڑھ کے پیچھے سے تم نکل کے میری طرف چلی آؤ۔

ایک بار مل جاؤ۔

ایک بار نظر کو سیراب کر دو۔

پھر میں خود ہی دل کے پاگل پن پر ہنس پڑا۔ وہ بھلا کہاں ہونے لگی۔ وہ تو انگلینڈ میں ہوگی۔ اپنے شوہر کے ہمراہ۔ اس کی محبتوں کی پھوار میں بھیگتی ہوئی۔

اور یہ تصور بڑا روح فرسا تھا۔ یوں جیسے کوئی دل کو چنبے کی کلی کی طرح مسل کے نچوڑ کے پھینک دے۔

''ایک بار آ جاؤ تنزیلہ'' میرے جسم کا رواں رواں جیسے اس کی طلب میں ہلکان ہو رہا تھا۔ دل کا ایک ایک تار اس کا منتظر تھا۔

یکا یک ہی اُس کی یاد کی آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

''تم آ کیوں نہیں جاتیں تنزیلہ'' ''بہت بے بسی سے لاچاری کے عالم میں میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور تھکے ہوئے افسردہ انداز میں آنکھیں موند کر تصور میں اسے پاس بلانے لگا۔

یوں جیسے یہ بھی کوئی عمل ہو۔

ہو سکتا ہے' کبھی وہ مجھے ملے مگر بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ اس دل کو تو ابھی اس کی طلب ہے۔

آ جاؤ۔ آ جاؤ تنزیلہ کہ۔

اس سے پہلے کہ دشتِ امکاں میں

وصلِ جاناں کی آرزو نہ رہے
اس سے پہلے کہ بارِ غم سے کہیں
تجھ کو پانے کی جستجو نہ رہے
اس سے پہلے کہ دشت کاہش میں۔
فرشِ افسردگی بچھے سرِ راہ
لوٹ آؤ کہ منتظر ہے نگاہ
اس سے پہلے کہ لوحِ قسمت پر
بابِ الفت تمام ہو جائے
اس سے پہلے کہ شام ہو جائے

زندگی میں پہلی بار دوسراہٹ کی خواہش دل میں جاگ تھی۔ اس سے پہلے خود کو اتنا اکیلا' اتنا ویران محسوس نہیں کیا تھا۔ اُس کی یاد میں گم ہو کر ساری دنیا فراموش کر ڈالتا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ محض یاد سے کام نہیں چلنے والا۔ دل اب اس کا ٹھوس وجود نظر کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو محسوس کرنے کی چاہ رکھتا تھا۔ یاد کا عمل تو مزید بے تابیاں بڑھا دیتا تھا۔

میں صحیح معنوں میں اُسے پانا' اُسے خود سے قریب کرنا چاہتا تھا۔ کب تک یاد کے کھلونوں سے دل بہل سکتا تھا۔

♥♥♥

میں جانے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ امی کے ہزار اصرار کے باوجود اُن سے پیسے نہیں لیے۔

''میں جاب کرتا ہوں۔ اپنا آپ خود سنبھال سکتا ہوں'' میری ضد کے آگے وہ بالآخر موش ہو گئیں۔ میرا ارادہ شام کی فلائنگ کوچ سے روانہ ہونے کا تھا۔ دوپہر کو چائے کی غرض سے نیچے آیا تو کوریڈور میں رکھے فون کی بیل بجی۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اُٹھایا۔ او ہیلو کہا۔

''ہیلو تحریم۔ میں تنزیلہ بول رہی ہوں''

میرا دل سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ پھر میں نے اپنی بدحواسی پر قابو پا لیا۔ یقیناً تنزیلہ اکرام ہو گی۔ بھلا تنزیلہ رحمٰن لاہور میں کہاں ہونے لگی۔ میں نے خود کو حقیقت پسندی سے سمجھایا لیکن میرا قیاس غلط ثابت ہو گیا۔

''تم نے اپنی واپسی کی اطلاع ہی نہیں دی۔ میں نے اسٹار کو کمپنی کو فون کیا تو پتا چلا' تم اسلام آباد گئے ہوئے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تحریم کہ میں تم سے مخاطب ہوں۔ اتنی طویل جدائی کے بعد۔ کہاں چلے گئے تھے تم؟''

وہی بھیگا بھیگا محبتوں سے چُور' شکوہ کناں دلربا' شریں لہجہ' وہی آہستگی' وہی دھیما پن' وہی نغمگی۔ یہ سو فیصد تنزیلہ رحمٰن کی آواز تھی۔

وہی تنزیلہ رحمٰن جسے کل میں شہر کے چپے چپے میں کھوجتا پھر تھا۔ ذرّے ذرّے سے اس کا پتہ پوچھا تھا۔ کیا میری یاد اتنی طاقتور تھی!!!

''تم لاہور کب آئیں!'' میں ہزار ردکٹے کے باوجود لہجے سے چھلکتی مسرت اور سرشاری کو نہ چھپا سکا تھا۔

''میں یہاں سے گئی ہی کب تھی۔ تحریم۔ میری روح' میرا دل میرے جذبات تو یہیں رہ

گئے تھے۔" اس کا بے خود کر دینے والا محبتوں کے جام چھلکاتا رواں لب ولہجہ میرے دبے ہوئے خمار آلود جذبوں کو جگانے لگا تھا۔

"تحریم' تم مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے؟" کس قدر وارفتہ و پیوستہ انداز میں ناز بھرے لہجے میں دریافت کیا گیا تھا۔ جی چاہا کہہ دوں' اسی آس پر تو جی رہا تھا اب تک مگر پھر ہوش مندی کی سرحدوں پر آ گیا۔ یہ تنزیلہ اکرام کی رفاقتوں کا اعجاز تھا کہ میں نے حقیقت پسندی سے کام لینا اور سوچنا شروع کر دیا تھا۔

"تم جمال احمد کی بیوی سے نہیں تنزیلہ رحمٰن سے ملنے آؤ گے۔" اُس نے مجھے چونکا دیا۔

"جمال احمد کا حوالہ ایک معتبر روپ میں ڈھل چکا ہے۔ اسے خود سے الگ کیسے کر سکو گی؟ میرے انداز میں طنز گھل گیا۔

"وہ مجھ سے الگ ہو چکا ہے۔ شادی کے محض تین دن بعد میں لاہور واپس آ گئی تھی۔"

آسمان بھی مجھ پر گر پڑتا تو اتنی حیرت نہ ہوتی' جتنی اس کے اس جملے نے قیامت برپا کر دی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم......؟" میرا ازداں رواں جیسے کان بن گیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا اور اعصاب یقین و بے یقینی کی کشمکش میں جکڑے ہوئے تھے۔ ایسا کیسے ہو گیا'

"ہاں' یہ سچ ہے۔ جمال احمد نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔" بالآخر اُس نے دھماکا کر دیا۔

♥ ♥ ♥

"اب مجھ سے دوری کے یہ عذاب نہیں سہے جاتے تحریم۔ میں مصلحت کی ہر زنجیر توڑ کر تم تک پہنچنے کو تیار ہوں۔ میں نے غلطی کی جو ممی پاپا کی ہاں میں ہاں ملا کے اپنی قسمت پھوڑ لی۔ میں تمہاری ہی تھی۔ تمہاری رہوں گی۔ جمال احمد تو ایک سیراب تھا۔ یوں سمجھو' وہ ہمارے درمیان کبھی آیا ہی نہ تھا۔"

کیسے سمجھ لوں۔ تمہارا اُس کے ساتھ باقاعدہ نکاح ہوا تھا۔ کیا ہوا' وہ تعلق۔ اپنی غلطیاں نظر آنا شروع ہو گئی ہیں تو میرے نقصان بھی شمار کر لینا جو تمہاری اور تمہارے باپ کی اس انجان "غلطی" کے نتیجے میں ہوئے ہیں۔" میرا لہجہ یکا یک برف کی طرح سرد ہو گیا۔

"جمال احمد کے بقول میں اُس کی پسند نہیں ہوں۔ یہ رشتہ اُس کے گھر والوں کی مرضی سے طے کیا گیا تھا۔ اسے انگلینڈ میں ہی اطلاع دی گئی تھی۔ شادی کی پہلی رات ہی اس نے مجھ سے مل کر مجھ پر واضح کر دیا کہ میں اس کے معیار پر پورا نہیں اُترتی۔ وہ ایک عرب شیخ کی سولہ سترہ سالہ نوخیز دوشیزہ پر فریفتہ ہے اور عنقریب وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ میرے ساتھ شادی کا سوانگ اس نے اپنی ماں کی انتہا درجے کی ضد پر رچایا تھا پھر اس نے شادی کے تیسرے دن مجھے واپسی کا ٹکٹ تھما دیا اور کہا کہ میں چاہے میکے رہوں یا سسرال' اسے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بہرحال اُس کے دل میں یا گھر میں نہیں بس سکتی۔ کیونکہ اُسی روز اُس کا اس کم عمر حسینہ سے نکاح طے تھا۔ میں واپس ممی پاپا کے پاس آ گئی۔ میرے سسرال والوں نے ممی پاپا کے ساتھ صلح صفائی کی بہتیری کوششیں کی ہیں مگر وہ مجھے بسانے پر آمادہ نہیں ہے۔ میں نے وطن واپس آتے ہی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر تمہارا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میں اس کشمکش سے نجات چاہتی ہوں تحریم۔ تم آج مجھے بلاؤ میں آنکھیں بند کر کے تمہارے پیچھے چلی آؤں گی اور جہاں لے جانا چاہو گے' میں تمہیں تیار ملوں گی۔ اب مجھے کسی کی عزت بے عزتی کی پروا نہیں رہی۔ میں کوئی موم کی گڑیا

تو نہیں ہوں جس روپ میں ڈھالا اور ڈھل گئی۔ مجھے تمہارے علاوہ اور کسی کی ذات کی پروا نہیں۔"

وہ آج پوری طرح آمادہ تھی۔ میرے ساتھ جانے کے لئے۔ عرفِ عام میں میرے ساتھ "بھاگنے" کے لئے۔ مگر میں جو اپنی ذات سے بھاگ بھاگ کر تھک چکا تھا' اب ان چکروں سے دور نکل آیا تھا۔ حقیقت میرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ تین دن ایک مرد کے ساتھ رہی تھی۔ مرد بھی وہ جو اُس کا شوہر تھا اور لازماً ناپسندیدگی کے باوجود اس نے اپنا استحقاق ضرور وصولا ہوگا۔ بھلا اتنی خوبصورت پرشباب لڑکی پر حق رکھتے ہوئے چھوئے بنا کیسے رہا ہوگا۔

اور اس سوچ نے میری کنپٹیاں سلگا دیں۔ میرے اندر لاوا دہکنے لگا۔

"تم تین راتیں اس کی تحویل میں رہی ہو۔ کیا اس نے تمہیں "بخش" دیا ہوگا' جب کہ وہ تم پر جائز شرعی حق رکھتا تھا۔"

میرے سپاٹ خشک لب و لہجے سے خشونت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

جواب میں اُدھر سناٹا سا چھا گیا۔ کتنی ہی دیر چپ طاری رہی۔ اور یہی چپ میرے خدشات کی تصدیق کے لئے کافی تھی۔ میرا دل سکڑ کر پھیلا اور پھر ڈوبنے لگا۔

"ہاں' یہ سچ ہے۔" ایک گہری طویل سانس کھینچ کر بالآخر اس نے اعتراف کر لیا اور میرا ضبط جواب دے گیا۔

یوں لگا تھا' جیسے آگ کا گرز پوری رفتار سے میرے دل کے چیتھڑے اُڑاتا چلا گیا ہو۔ مجھ پر بلا کی وحشت سوار ہوگئی۔ ایک دھماکے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ کر میں آندھی طوفان کی طرح اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

♥ ♥ ♥

تم میرے پاس رہو۔
میرے قاتل مرے دلدار' مرے پاس رہو۔
جس گھڑی رات چلے۔ آسمانوں کا لہو پی کے سیاہ رات چلے۔
بین کرتی ہوئی' ہنستی ہوئی' گاتی نکلے۔
درد کی کاسنی پازیب بجاتی نکلے۔
بھر نا آسودگی مچلے تو منائے نہ منے۔
جب کوئی بات بنائے نہ بنے۔
جب نہ کوئی بات چلے۔
جس گھڑی ماتمی' سنسان سیاہ رات چلے۔
تم میرے پاس رہو۔
میرے قاتل' میرے دلدار' میرے پاس رہو۔

"میری چیز یا تو مکمل طور پر میری ہوتی ہے یا پھر میری نہیں ہوتی۔ میں ادھورے استحقاق کا قائل نہیں ہوں۔ یا بے حد محبت ہو یا بہت نفرت' درمیانی راہ نکالنا میری روایت میں درج نہیں ہے۔ جب تک وہ تنزیلہ رحمٰن تھی۔ وہ سرتاپا میری تھی مگر تنزیلہ جمال احمد بن جانے کے بعد وہ میری دسترس سے دور ہوگئی ہے۔ میں اُسے اب اس روپ میں قبول نہیں کر سکتا۔ میں تو اپنے ہاتھ سوپ' اپنے ناول' اپنے بیڈ کا کسی سے بٹوارہ نہیں کر سکتا تو محبوبہ کیسے شیئر کر سکتا ہوں۔ یہ احساس ہی مجھے زندہ جلا کے بھسم کر ڈالنے کو کافی ہے کہ۔۔۔"

مجھے تم اس عالم میں سیدھے سیدھے پاگل لگ رہے ہو۔" تنزیلہ نے لگی لپٹی رکھے بغیر تنگ

آ کر کہہ دیا۔

''ایک طرف تم اُس کی خاطر' اُس کے حصول کے لئے اپنی زندگی' اپنا مستقبل' اپنا کیریئر تباہ کر بیٹھے ہو۔اس کے لئے ساری دنیا چھوڑے ہوئے ہو اور دوسری طرف اس سے دور بھی بھاگنا چاہتے ہو۔اسے قبول نہیں کرنا چاہتے۔یہ کون سی محبت ہے۔کم از کم میری سمجھ سے تو باہر ہے۔''

''اُس کو چاہنا میری بے اختیاری ہے اور اس کو قبول کرنے سے انکاری ہونا میرا'' فطری ردِعمل۔'' پیشانی کو انگلیوں سے مسلسل دباتا ہوا میں کسی قدرے بے بسی سے کہنے لگا۔

''میں تاعمر اس کی یاد میں تنہا بسر کر سکتا ہوں مگر اُس کو اپنی زندگی میں شامل کر کے شاید ایک لمحہ بھی نہ گزار پاؤں۔اب ایسی حالت میں اسے پا کے کیا ملے گا مجھے۔گوہر مقصود کی آب و تاب تو ختم ہو چکی ہے۔تتلی کے پروں کے رنگ اُڑ جائیں تو باقی کیا بچتا ہے۔''

''ابھی تم کہہ رہے تھے کہ جمال احمد اور تنزیلہ کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی' اس نے پہلے دن ہی اسے ناپسند کر دیا تھا اور تیسرے روز گھر بھیج دیا تھا۔پھر وہ بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

وہ ناسمجھی کے عالم میں اُلجھ کر پوچھ رہی تھی۔

''آپ بھی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی سیدھی ہیں۔'' میں جھلا سا گیا۔

''اس نے ناپسند ضرور کیا تھا مگر رات اسی کے ساتھ بسر کی تھی۔'' میں نے دھیرے سے وضاحت کرتے ہوئے یونہی اُس کی طرف دیکھا۔اس نے بے ساختہ چہرے کا رخ قدرے ترچھا کرتے ہوئے نگاہ جھکا لی تھی۔

''خیر۔یہ سب باتیں محبت کرنے والوں کے لئے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔'' وہ میرے لہجے کے تاثر سے باہر نکلنے کو پلکیں اُٹھا کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتنی عمر کو پہنچنے کے باوجود' شعور اور فہم و فراست کی اعلیٰ حدود تک رسائی پانے کے باوجود اُس کے انداز و اطوار میں بلا کا حجاب اور جھجک شامل تھی۔مجھے اس کی یہ ادا بہت دلفریب لگی۔

اتنے سارے بے باک نفس زدہ جذبات سے لتھڑے چہروں کے درمیان اُس کا شرمیلا روپ بہت انوکھا سا تاثر دیتا تھا۔وہ ایک جہاندیدہ عورت ہوتے ہوئے حیا و حجاب کے دائرے میں رہتی تھی اور ماہرہ اس کے مقابلے اتنی کم عمری میں گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر بھی بلا کی بے باک اور نفس پرست تھی۔

میں جب سے کابل سے آیا تھا' اُس سے ٹاکرا نہیں ہوا تھا۔وہ اپنی خالہ کے ہاں سیالکوٹ

گئی ہوئی تھی' چھٹیاں گزارنے اور ابھی تک اُدھر ہی تھی۔

''محبت کرنے والے محبوب کی روح کی پاکیزگی اور جذبوں کی وارفتگی پہ نظر رکھتے ہیں۔ باقی چیزیں اُن کے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں۔حقیقی زندگی میں ان پر عمل کرنا تقریباً تقریباً ناممکن ہے۔برتے ہوئی جذبے پاکیزہ نہیں رہتے۔اور وارفتگی بھی جھوٹی پڑ جاتی ہے۔میں پاک صاف سیپی میں بند موتی جیسی تنزیلہ کو چاہا تھا۔ایک مرد کی ٹھکرائی ہوئی' دھتکاری ہوئی عورت کو قبول کرنا بڑے دل گردے والے مرد کا کام ہوتا ہے اور میں یقیناً اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر حالت جنگ میں کیوں رکھا ہوا ہے سب کو۔اگر ایسے ہی بسر کرنی ہے تو پھر اپنے گھر والوں کی بات مان لو۔''

''کیسے مان لوں میں اُن کی بات......؟'' پیشانی پر آئے بالوں کے گچھے کو پیچھے پھینکتے ہوئے میں نے اُلجھے ہوئے خشک انداز میں کہا۔''میں یہ باب ختم کر چکا ہوں اور انہیں واضح طور پر بتا کر آ رہا ہوں کہ تنزیلہ میری زندگی میں شامل ہو یا نہ ہو' ماہرہ بہر حال کسی صورت اس گھر میں بہو بن کے نہیں آ سکتی۔جب وہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔'' میرا انداز قطعی اور ہٹیلا تھا۔

میرے گومگو کے سے سمجھ میں نہ آنے والے انداز پر وہ جھنجھلا رہی تھی۔

''لو اور سنو۔اب یہ کمال بھی کر آئے۔'' وہ ناراضگی بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''ابا جی میرا نکاح کرنا چاہتے تھے۔اُن کا کہنا تھا کہ اکبر تایا کی بیٹی کو گھر لا کر ہم سیما آپا کے معاملے میں دباؤ ڈالنے کی مضبوط پوزیشن میں آ جائیں گے۔لامحالہ اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے لئے وہ انتصار بھائی کو رشتہ قبول کرنے کے لئے آمادہ کر لیں گے۔میں نے صاف جواب دے دیا' اس پر ابا جی بولے تو پھر سمجھ لو آج سے ہمارا تمہارا رشتہ ختم ہوا۔تم جب تک ماہرہ سے شادی کی حامی نہیں بھرو گے' ہمارے دل میں تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ایسے میں' میں جوش میں آ کر کبھی واپس نہ آنے کی قسم نہ کھاتا تو اور کیا کرتا۔''

میں نے تائید چاہنے والی نظروں سے تنزیلہ کی سمت رخ کیا۔اس نے طویل سانس لی۔

''ساری بات یہ ہے کہ تمہیں اپنا مقدمہ لڑنے کا سلیقہ نہیں آتا۔شروع ہی سے تم نے ناقص عملی کے سبب اپنی ضد اور جذباتیت سے کام لے کر گھر والوں کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔تم اپنی

بہن سے یا ایاز سے سلیقے طریقے سے بات کر کے اپنے ماں باپ تک اپنی رائے پہنچا سکتے تھے۔ مگر تم نے ہٹ دھرمی سے ماں باپ کو انکار کر دیا جس سے اُن کی انا پر چوٹ پڑی پھر اپنے بھائی ایاز سے جذبات و احساسات کی پروا نہ کرتے ہوئے تم نے صرف اپنی غرض و مطلب کے لئے منہ بھر کر ماہرہ سے شادی کے لئے ناں کر دی' اس طرح گھر کے دیگر افراد کی ہمدردیاں بھی گنوا بیٹھے۔ دوسری حماقت تم نے یہ کی کہ گھر والوں کی وقتی ناخوشی او خفگی کو بنیاد بنا کر اُن سے بدظن ہو گئے۔ کون سے ماں باپ ہیں جو اپنی اولاد کے گستاخانہ رویے پر برہم نہیں ہوتے۔ نافرمانی اور ضدی پن تو شفیق سے شفیق والدین کو مشتعل کر دیتا ہے۔ تم نے اُن کی برہمی کو اُن کی نفرت اور بے توجہی پر محمول کرتے ہوئے ان کو اپنا دشمن سمجھ لیا اور دیوانگی کے عالم میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ مزید یہ کہ اپنے متعلق کچھ اطلاع بھی نہ دی۔ ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ پیچھے گھر والوں کا پریشانی کے مارے کیا حشر ہوگا۔ انہوں نے کہاں کہاں نہ تمہیں تلاش کیا ہوگا۔ اور اب اتنے مہینوں بعد' اتنی مدت بعد اچانک اُن سے ملے اور دوبارہ انہیں ناراض کر کے چل دیے۔ مجھے بتاؤ' یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ جسے اپنے والدین اور گھر والوں کی محبت کا احساس نہیں' اُن کے جذبات و احساسات سمجھنے کی توفیق نہیں' وہ کسی دوسرے غیر شخص کی محبت اور چاہت کو کیوں کر مقدم رکھ سکتا ہے؟ مجھے تو ابھی تک شک ہی ہے کہ آیا تم واقعی تنزیلہ سے سچی قسم کی محبت کرتے ہو یا محض اس کے ریشمی حسین سراپے کو پانے کی جستجو میں عمر گنوائے دے رہے ہو۔ اگر تمہیں اس سے سچی محبت ہوتی تو تم کبھی بھی اس طرح کی ٹال مٹول سے کام نہ لیتے۔ ایسا لگا ہے' تم صرف اس کے حسن و شباب کے طالب تھے اور اب جبکہ تمہیں پتہ چل گیا ہے کہ اس کا حسن کسی اور سے خراج لے چکا ہے تو تمہاری آفاقی قسم کی محبت کے غبارے سے ہوا نکل گئی ہے اور واقعتاً تمہارے جذبات دودھ کا اُبال ہی ثابت ہوئے ہیں۔

اس نے کچھ اس درجہ بے رحمی اور سنگدلی سے حقائق سے پردہ سرکایا تھا کہ میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ میرا دماغ جیسے کسی سیاہ تاریک گڑھے میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ خیالوں کی یلغار سے عقل و فہم کی دنیا تہ و بالا ہو رہی تھی۔

''آپ واقعی زندگی کی بے رحم سرجن ہیں۔ براہ کرم خاموش ہو جایئے۔ ورنہ میرے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ میں بہت تکلیف میں ہوں پلیز......؟ میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر سنسناتے ہوئے کانوں پر انگلیاں جما دیں۔ رگ رگ میں محشر بپا تھا۔

جسم سے آتشیں سیال مادہ نکل کر وجود کے روئیں روئیں وحشتیں جگا رہا تھا۔

میں اس وقت اعلیٰ درجے کی اعصابی شکستگی کا شکار تھا۔ میں تنزیلہ رحمٰن سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اسے زندگی کا حاصل سمجھتا تھا۔ اس کے لئے ساری دنیا سے ناتا توڑے بیٹھا تھا۔

میں اسے پانا چاہتا تھا مگر اب اس طرح۔ ایسے۔ اور کیسے!''

میرا دل اُسے اس حالت میں قبولنے کو تیار نہیں تھا۔

یہ تصور نہیں' آگ تھی جس میں میرا دل' میرا دماغ' میرا وجود جل اٹھا تھا۔

اتنی سفاک حقیقت موجود ہوتے ہوئے میں کیسے نظر بچا سکتا تھا۔

حقیقت تو میرے سامنے تھی۔ واضح تھی۔ روشن تھی۔

بے شک لوگ مطلقہ یا بیوہ سے شادیاں کرتے ہیں اور خوش و خرم زندگی بھی بسر کرتے ہیں مگر میں ان عالی ظرف مردوں جیسا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

اپنی چیزوں کے معاملے میں بہت بچی تھا۔ میری چیز صرف میری ہے اور کسی کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔

پھر یہ تو زندگی بھر کا معاملہ تھا۔

وہ میلی ہو چکی تھی۔ اس کا کنوارا پن کھو چکا تھا۔

میں اُسے کیسے قبول کر لیتا۔ میں کسی کا جھوٹا نہیں کھا سکتا تھا۔

اور اس کا بدن جھوٹا پڑ چکا تھا۔

''تمہیں جذبوں پر نظر رکھنی چاہیے' جسم تو ویسے بھی فانی ہوتا ہے۔ جمال احمد نے جذبے تو نہیں برتے نان۔''

''خالی جذبوں کو لے کر میں کیا کروں گا۔'' تنزیلہ کی دلیل کے جواب میں' میں نے ایک خاموش نگاہ اس پر ڈال کر تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا تھا۔

''اتنی جلدی تمہارا عشق ٹھنڈا پڑ گیا۔ تم تو کہتے تھے' تا زندگی یہ شعلہ روشن رہے گا اور ایک دن آتش فشاں بن کر سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالے گا۔ اب تک تو اس شعلے نے تمہاری زندگی اور تمہارے کیریئر کے ماسوائے کچھ تباہ نہیں کیا۔ کیسی بچوں جیسی جذباتیت ہے جس کو تم نے محبت کا نام دے رکھا ہے۔ وہ بھی کوئی محبت ہے جس کا منتہا صرف جسم کا حصول ہو' جذبوں اور روحوں کا ملاپ نہیں۔''

رہ رہ کر تنزیلہ اکرام کے چبھتے ہوئے کٹیلے جملے میرے اعصاب پر گولوں کی طرح برس رہے تھے۔

دراصل مجھے خود بھی اپنی وحشتوں کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک طرف میں اس کے لئے تڑپ رہا تھا تو دوسری طرف اسے موجودہ حیثیت میں اپنانے سے بھی گریزاں تھا۔

میرے پاگل جذبے مجھے اس کے حصول کے لئے اکساتے تھے اور میری پوزیشن مجھے اس تک رسائی کے راستے سے واپس موڑ لاتی تھی۔

اس دوطرفہ جنگ میں میرا وجود کسی تنکے کی مانند اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔ ایک طوفان بلاخیز تھا جو ذہن و دل کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

ایسے میں تنزیلہ رحمن کے سنگ گزرے محبتوں کی مسرتوں سے مزین دو سال ورق ورق میری آنکھوں کے سامنے بکھرتے چلے گئے۔ اس کے خوشبودار خطوط' کیسٹس' اس کا معصوم پیار اور اس کے اظہار کے دلربا اور وارفتہ انداز۔ اس کا دلنشین چہرہ اور اس پر پھوٹتے محبت اور سرخوشی کے حسین رنگ۔

''تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟ ایک مرتبہ میں نے بگڑ کر سوال کیا تھا۔

''تم سے نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی.....؟''

اس نے کس قدر دل و جان کھینچ لینے والے' پاگل کر دینے والے مخمور لہجے میں فدا ہونے والے انداز میں جواب دیا تھا پھر جانے کیا ہوا۔ یکا یک میرا دل اُس کے لئے' اُس کی محبت بھری آغوش کے لئے' اس کے دیدار کے لئے ہمکنے لگا۔

وہ میرے اندر جاگنے' کو کنے لگی۔ اس کے محبت کی خوشبو میری ایک ایک سانس کو مہکاتی معطر کرتی چلی گئی۔ عجب گھڑی تھی۔

کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی۔

چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں اُلجھے آنسو بلا رہے تھے۔

مگر مجھے ہوش ہی کہاں تھا۔

نظر میں ایک اور ہی جہاں تھا۔

نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں۔ نئے نئے دائروں کی گردش

میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوا۔ صلہ' جزا' خوف' نا اُمیدی۔

اُمید' امکان' بے یقینی۔

ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں۔

اب اس سے پہلے کہ رات اپنی کمند ڈالے' یہ چاہتا ہوں کہ لوٹ جاؤں

عجب نہیں وہ کتاب اب بھی وہیں پڑی ہو۔

عجب نہیں آج بھی میری راہ دیکھتی ہو۔

چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں اُلجھے آنسو۔

ہوا و حرص و ہوس کی سب گرد صاف کر دیں۔

عجب نہیں میرے لفظ مجھ کو معاف کر دیں۔

عجب گھڑی تھی۔

کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی۔

♥♥♥

''بے شک وہ کیچڑ میں گری ہوئی کتاب بن گئی ہے اب۔ مگر میں نے سوچا کہ اس کتاب کا ایک ایک حرف میرے لئے ہی تو تھا۔ میرے نام ہی تو کیا گیا تھا۔ کیا ہوا جو مجھ سے پہلے کسی نے اس کتاب کو پڑھ لیا اور کیچڑ میں آلودہ کر دیا ہے تو یہ میری نہ ناں۔ سو میں فیصلہ کیا کہ اس کتاب کو اُٹھا کر کیچڑ سے پاک کر کے اپنے پاس رکھ لوں۔ اپنی چیزوں کی حفاظت کرنی چاہیے ناں۔ میں نے ٹھیک کیا ناں؟'' اگلے روز تنزیلہ کے روبرو میں چمکتی ہوئی آنکھوں میں عجیب سے بے قراری لئے ہیجانی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

جواب میں اس نے ایک گہری ٹٹولتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''مجھے ڈر ہے' جس تیز رفتاری سے تم فیصلے بناتے اور بدلتے جا رہے ہو، اس افراتفری میں کہیں کوئی غلط مصیبت نہ مول لے لو۔ طبیعت میں اتنی غیر یقینی کیفیت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اپنے قول و فعل میں استقامت پیدا کرو۔ خوبصورتی شخصیت کے تضاد سے نہیں' تسلسل سے عبارت ہوتی ہے۔''

اس کے لہجے میں میرے لیے بلا کی تادیب اور پریشانی تھی۔ میں کوفت کے عالم میں اسے گھورنے لگا۔

''کبھی تو اپنے وعظ و نصیحت سے ہٹ کر بھی کوئی میٹھی سہانی' مزیدار بات کر لیا کرے ہر وقت بندوق تانے رکھتی ہیں سر پہ۔''

میرے لہجے کی مصنوعی ناراضگی پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''تم بھی کبھی تخیلاتی دینا سے باہر قدم رکھنے کی زحمت کر لیا کرو۔ ہر بات جذبات سے سوچتے ہو۔ زندگی کے معاملات عقل سے حل کئے جاتے ہیں' محض جوش اور نعروں سے انقلاب نہیں آیا کرتے۔''

''سنئے......آپ کے سینے میں ''دل'' نامی کوئی چیز آباد ہے یا نہیں؟'' میں معصومیت بھرے

انداز میں پوچھنے لگا۔

''ایسا دل نہیں ہے جو پل دو پل میں آگ سے پانی بن جائے۔'' میں نے جتنے چلبلے پن سے پوچھا' اس نے اتنے ہی آرام سے پرانے والے انداز میں جواب دیا تھا۔

''ویسے سچ بتایئے' آپ کے دل میں خوبصورت جذبوں کی بارات کب اتری تھی؟''

میرے سوال کے جواب میں اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس کی گھنی پلکوں میں ارتعاش بپا ہو گیا اور بھوؤں کی کمانیں سکڑ کر ایک دوسرے کے قریب ہونے لگیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی بے اختیار حرکات و سکنات اور ردِ عمل پر قابو پا چکی تھی۔

''جی نہیں۔ میرے دماغ میں ابھی یہ کیڑا نہیں رینگا۔'' مگر مجھے اس کا بشاش لہجہ مصنوعی سا لگا۔

''میں کیسے مان لوں۔ آپ جس طرح میرے جذبات و احساست کو سمجھ کر مجھے سمجھاتی ہیں' یہ رویے از خود اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ کبھی آپ پر بھی یہ کیفیات گزر چکی ہیں۔ تبھی تو آپ میرے دل کی بات سمجھتی ہیں۔ دیکھئے کل آپ نے جو لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں رات تا دیر آپ کی باتوں کو سامنے رکھ کر موجودہ صورت حال پر غور کرتا رہا اور پھر اسی نتیجے پر پہنچ گیا جس پر آپ مجھ سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ ایسی کوئی بات ہے ناں؟

میں اس کی کھلی کھلی شفاف آنکھوں میں جھانکتا وثوق سے کہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں مجھے بہت پسند تھی۔ ایک دم صاف شفاف' بے ریا' سچی' سادگی اور پاکیزگی سے لبریز۔ اس کی آنکھوں میں کسی قسم کی کوئی آلودگی' کوئی فریب' کوئی غرض نہیں جھلکتی تھی۔ بے پناہ شگفتہ اور متین چمک تھی اُن میں۔

اور اس کی نارمل سائز کی عام سی آنکھوں کا یہ تاثر انہیں ایک سے ایک بڑھ کر آہو صفت حسین آنکھوں کے مقابلے مین غیر معمولیا دتارکن بنا دیتا تھا۔

بذات خود تنزیلہ اکرام کے نین نقوش میں کوئی خاص دلکشی نہیں تھی۔

کچھ لوگ ہر لحاظ سے خوبصورت ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے نین نقش یا کسی ایک خاص عضو کی خوبصورتی کے باعث پرکشش کہلاتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ بظاہر عام سے ہوتے ہیں۔ نہ ان کا جسم خوبصورتی میں شامل کیا جاتا ہے اور نہ نین نقش غیر معمولی دلکشی کے باعث توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر اُن کی پرسنالٹی میں' اُن کی ایک ایک انداز میں ایک خاص قسم

کی کشش اور دلآویزی ہوتی ہے ان کی شخصیت کچھ ایسی سحر انگیز اور دلفریب محسوس ہوتی ہے کہ بعض اوقات حسین سے حسین صورتوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ تنزیلہ اکرام کا شمار ایسی ہی نفیس شخصیات میں ہوتا تھا۔

اس کے سراپے غیر معمولی جاذبیت اور شاہانہ پن جھلکتا تھا۔ بہت ٹھنڈا میٹھا فرحت بخش تھا اس کا ساتھ۔ اس کی رفاقت۔ اس سے بات کر کے بندہ ہلکا پھلکا ہوا جاتا تھا۔

''آپ کی شادی ہو چکی ہے تنزیلہ؟'' معاً مجھے خیال آیا۔ میں نے آج تک اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اپنے جھمیلوں میں اُلجھا اور اُسے اُلجھاتا رہتا تھا۔ کبھی اس کی ذات کے بارے میں جاننے کا مجھے خیال نہیں آیا تھا۔ مجھے ندامت سی ہوئی۔ ہمیشہ اپنے ہی دکھڑے روتا رہا تھا اس سے۔ اُس کی بابت تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔

''کیا بکواس ہے۔'' جواب میں وہ اس طرح اور اس قدر شرمائی کہ میں دنگ سا اُس کا ایک دم شرم سے سرخ پڑ جانے والا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

''ارے......'' مجھے یکلخت ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

''آپ تو یوں شرما رہی ہیں جیسے......'' میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ کہیں میری اس گستاخی کا وہ برا نہ مان جائے۔

''سوا سٹرینج......کتنی اچھی لگی ہیں ابھی ابھی آپ۔'' میں نے محبت سے اُس کا لجایا کترایا روپ دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑی دیر بعد اور بہت مشکل سے وہ اپنی شرم آمیز گھبراہٹ پر قابو پا سکی تھی اور اپنی کمزوری پر دل ہی دل میں جھلاتی ہوئی میری شریر نظروں سے نگاہ کترا رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے ہمارے جیجا جی ابھی وجود میں نہیں آئے۔'' میں ہنوز اس کی کیفیت سے لطف لے رہا تھا۔

''ویسے میں اُس نادیدہ حوصلہ مند مرد میدان کے حق میں دل سے دعا گو ہوں۔ بے چارے کو کانوں کی ایک ایکسٹرا جوڑی خریدنا پڑے گی۔ آپ تو دن رات لیکچر پلا پلا کر چار دن میں اُسے سماعت سے محروم کر دیں گی۔''

''بدتمیز۔'' جواب میں اس نے تڑ سے اپنا پرس میرے سر پر دے مارا۔ پہلی مرتبہ میں اس سے شوخ ہوا تھا اور اس نے بھی اتنے عرصے کے ساتھ میں پہلی دفعہ بے تکلفی کا ایسا مظاہرہ کیا

تھا۔ حسبِ سابق مجھے اس کی یہ ادا بھی بہت بھائی۔

کتنی مدت ہو گئی تھی ہنسے ہوئے۔ جانے میں کب سے نہیں ہنسا تھا۔

جیسے ہنسی میرے لبوں کے لئے اجنبی ہو گئی تھی۔ کبھی آئی بھی تو ایک مہمان کی طرح جیسے فوراً واپسی کا سفر طے کرنے کی جلدی ہو۔

''اچھا پھر بتائیں ناں۔ میں تنزیلہ کو کیا جواب دوں۔؟'' میں یک بیک پھر سنجیدہ ہو گیا۔

''وہ کیا کہتی ہے؟'' اس نے جواب سے قبل سوال داغ دیا۔

''وہ میری مرضی جاننے کی منتظر ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ ہم بھاگ جائیں اور شادی کر لیں۔'' یہ بات سن کر اس کے تیور بدل گئے۔ اس کے چہرے سے برہمی جھلکنے لگی۔

''بھاگ جائیں۔ کس سے؟ کیا دنیا سے' حالات سے' حقائق سے یا پھر خود سے؟ بھلا فرار بھی کبھی مسئلوں کا حل ہوا کرتا ہے۔ سراسر احمقانہ خیال ہے۔'' اس نے کوفت سے سر جھٹکا۔

''تو پھر آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی جما کر سکون سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''انتظار۔'' اس نے مختصر ترین پیرائے میں جواب دیا۔ اور میرا جی چاہا' دنیا کی ہر شے کو درہم برہم کر دوں۔

''یہ لفظ میری زندگی سے جونک کی طرح چمٹ گیا ہے۔ ایک عمر سے اُس کے ناز اُٹھا رہا ہوں۔ اب مجھ میں مزید سکت نہیں رہی۔'' میں بگڑ کر کہنے لگا۔ ایک دم سے ہنستے چہچہاتے آشیانے پر برق گر پڑی تھی۔ دوبارہ سے دل کے مناظر دھند کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

برف کے سرد گالے جذبات کی دہلیز پر پھر سے اپنا تسلط جمانے لگے تھے پھر وہی شکستہ دلی اور اعصاب کی کھولن عود کر آئی۔ خوشی کی کلیاں بھی کتنی مختصر مدت کے لئے زندگی کے چمنستان میں کھلتی ہیں۔

جبکہ غم کے سدا بہار درخت ہمیشہ ہرے بھرے رہتے ہیں ایک پل میں ہنسنا' اک پل میں رونا' اک پل میں پانا' دوجے میں کھونا' اک پل میں میلہ' اک پل میں اکیلا۔

واہ رے مولا۔ کیا شے بنائی ہے تو نے! زندگی کے نام پر کتنا حسین مذاق کیا ہے اشرف المخلوقات سے۔

''اب میں کس بات کا انتظار کروں۔ کیا اب بھی صرف انتظار سے جھولی بھروں گا؟'' میں

روہانسا ہو کر بے بسی سے اس کا چہرہ تکتا رہا تھا جہاں دور دور تک سکون اور ٹھہراؤ ہلکورے لے رہا تھا۔

''انتظار تو کرنا ہوگا تمہیں۔''

''مگر کس بات کا......'' میں چیخ پڑا۔

''اس بات کا کہ تنزیلہ کی زندگی کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ ابھی وہ قانونی طور پر تنزیلہ جمال ہے' اسے طلاق نہیں ہوئی اور پھر کیا خبر تنزیلہ کے والدین صلح صفائی کی کوئی راہ نکال لیں۔ ابھی تمہیں پتا نہیں کہ اُن کی کیا مرضی ہے۔ وہ کیا چاہتے ہیں؟ بیٹی کی جذباتیت کے برعکس یقیناً وہ اس کا گھر بسانے کی تگ و دو میں ہوں گے۔ ابھی جب تک کوئی قانونی فیصلہ نہیں ہو جاتا' تمہیں انتظار تو کرنا ہوگا۔''

اور یہ بات میرے اعصاب چٹخانے لگی۔ کھوئی ہوئی' سوئی ہوئی وحشتیں پھر سے لوٹنے لگیں۔ بے بسی اور لاچاری کا یہ احساس میرے اندر الاؤ دہکانے لگا۔

ابھی ابھی اس تک پہنچنے کے لئے مجھے ایک اور خارزار عبور کرنا تھا۔ بجھے ہوئے کانچ پر لوٹنا تھا' ابھی بھی منزل دور تھی۔

اب جب کہ میں ایک پل بھی اس سے دور نہ رہنا چاہتا تھا۔ حالات پھر اسے مجھ سے دور کیے دے رہے تھے۔

اب جب کہ میرے دل میں اُس کی طلب پوری شدّت سے بھڑک اُٹھی تھی' ایک بار پھر مجھے حالات کے ہاتھوں طلب کے اس پار تپتے صحرا کی صدائیں نظر انداز کرنا پڑی تھیں۔

مگر تاب کے...... میرا ضبط' میری پرہیز گاری اور میرا اپنے نفس پر ظلم کرنے کا یہ سلسلہ آخری حدوں کو ہوتے ہوئے بالآخر کمزور پڑنے لگا۔ اور کمزوری کی یہ دراڑ ہوتے ہوتے ایک بڑے شگاف میں بدل گئی۔

مجھے شاید اس شگاف کی خبر نہ ہوتی مگر ماہرہ کی واپسی نے اس شگاف کو کھول کر پھاٹک میں بدل دیا۔

♥♥♥

اس رات میں ٹیرس پر چارپائی بچھا کے پیڈ اسٹل فین لگا سویا تھا۔ کمرے میں بہت گرمی لگ رہی تھی۔ گھر میں اے سی تو تھا مگر وہ نیچے کشادہ ڈرائنگ روم میں لگا ہوا تھا جہاں رات کو تائی نوراں' ماہرہ' طاہرہ' نواز اور میکے آنے والی کوئی نہ کوئی بہن مع اپنی اولاد کے رات کو بستر لگا کر سوتے تھے۔ دن کو بھی زیادہ تر یہیں ڈیرہ جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹی وی اور وی سی آر' اسی کمرے میں موجود تھے۔ سارا سارا دن ڈش کا ریسیور آن کیے آن ٹھنڈی خنک فضا میں پڑے اینڈتے رہتے تھے۔

میرا کمرہ اوپر تھا۔ ساتھ کے کمرے میں انتصار بھائی اور نثار ہوتے تھے۔ انتصار بھائی تایا اکبر کے ساتھ ان دنوں لاہور گاؤں گئے ہوئے تھے سو اوپر صرف میں اور نثار تھے۔

تائی نوراں کے کہنے پر مائرہ نے میرا اور نثار کا پلنگ باہر ٹیرس پر بچھا دیا تھا مگر نثار زیادہ دیر تک ادھر نہیں ٹک سکا۔

''بھائی جی۔ مجھے تو مچھر تنگ کر رہے ہیں۔ میں نیچے امی لوگوں کے پاس جا رہا ہوں سونے۔'' وہ اپنا تکیہ اُٹھا کے سیڑھیاں اُتر گیا۔

میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ مچھر سے زیادہ اسے انڈین موویز کا وہ تصور تنگ کر رہا تھا جو وہ اور نواز انتصار بھائی کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے آج شام ہی وڈیو شاپ سے لے کر آئے تھے۔ وہ بہت مصروفیت کے عالم مین گھر آتے اور رات گزار کر صبح آٹھ بجے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ ایسے میں کوئی بات اُن کے مزاج کے خلاف ہو جاتی تو بری طرح برس پڑتے تھے۔ کام کی زیادتی اور ذمّے داریوں نے انہیں تنگ مزاج بنا دیا تھا۔

اس وقت اہل خانہ یقیناً وڈیو کیسٹس میں غرق ہوں گے۔

میں نے نواڑی پلنگ پر کروٹ بدلتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ چودھویں کا چاند تھا۔ ہر طرف دودھیا چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ پیڈ اسٹل فین کی ٹھنڈی ہوا آنکھوں میں خمار بھر رہی تھی۔ مگر کوشش کے باوجود بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ایک بے چینی سی اعصاب کو جگائے رکھنے

پر مجبور کر رہی تھی۔

میں بالآخر بستر چھوڑ کر ٹہلنے لگا۔ پھر ریلنگ پر کہنی ٹکائے یک ٹک چاند کی سمت دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسو ہوا جیسے چاند کے گول ہالے میں اس کا سراپا نمودار ہو رہا ہو۔ دودھیا' نقرئی چاندنی اور بیلے کی کلیوں سے گندھا گداز وجود جھلکتے ہوئے بھرے بھرے ہونٹ' نشیلی آنکھیں' چاندی پیشانی گھنگھور گھٹا سے بال۔ اس کی بے ایمان کر دینے والی مسکراہٹیں' ادائے کارفرانہ!!!!!

میرے من میں پیاس شور مچانے لگی۔

میں نے بے بسی سے اپنی خالی مٹھیوں اور ویران بانہوں کی سمت دیکھا اور دل مسوس کر رہ گیا۔

میرے اندر انگارے سے چٹخنے لگے تھے۔ مرمریں بازو' حسین قاتلانہ جاذب نظر نقوش مجھے بلانے لگے۔ ریشم کا گداز میرے سینے میں آنچ دہکانے لگا۔

یکا یک میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم طلب کی آگ میں پھنک رہا ہے۔

میرے اندر بے تابیوں کے عفریت چنگھاڑ رہے تھے۔ بحر جذبات متموج ہوا جا رہا تھا۔

میں دوران خون تیز ہونے لگا اور سانسیں اعتدال کا دامن چھوڑ بیٹھیں۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے میرے اندر سمندر ہانپ رہا ہو۔ میری سانسوں میں منہ زور آندھیوں کے جھکّو سرسرا رہے ہوں۔

جی چاہ، ہا تھا جو بھی شے ہاتھ آئے' اسے چیر پھاڑ کے رکھ دوں' وحشت کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز کے پرخچے اُڑا دینے کو تیار بیٹھا تھا۔

معاً ٹیرس کا دروازہ کھلنے کی ہلکی سی دھیمی سی آواز کان میں پڑی۔

میں نے ریلنگ سے ٹکے ٹکے ذرا سی گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ چاند کی دودھیا روشنی میں ایک نسوانی وجود میری سمت حرکت کرتا نظر آ رہا تھا۔ قریب آیا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ ماہرہ تھی۔ آج صبح ہی سیالکوٹ سے واپس آئی تھی۔

''وہ......وہ میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں' کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔'' میری نظر کے جمود سے بوکھلا کر وہ صفائی دینے والے انداز میں ہکلا کر گویا ہوئی۔ اُس روز کے بعد اُسے دوبارہ مجھ سے شوخ ہونے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ میرے غضبناک تیوروں سے خوفزدہ ہو کر وہ مجھ سے کترانے لگی تھی اور آج اتنی مدّت بعد مجھے دیکھ کر وہ شاید دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوبارہ چلی آئی

تھی بہانے سے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ سے غالباً پہلی مرتبہ سرتاپا اُس کا جائزہ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے یکلخت میرا جسم سنسنا اُٹھا ہو۔

اس کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس ہو گی مگر اس کے جسم نے عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ سرعت سے شباب کے نصاب پڑھ ڈالے تھے۔ وہ دُہرے بدن کی قدرے ناٹے سے قد کی جوان لڑکی تھی۔ جسم قدرے فربہی مائل تھا مگر کچھ اس طرح کہ تناسب و توازن قائم تھا اور غضب کا کشش انگیز بھی۔ اُس کی رنگت سانولی تھی جس میں صحت مندی کی سرخی نے نکھار سا پیدا کر دیتا۔ نقوش میں جوانی کے رنگ بول رہے تھے۔ ہونٹ قدرے موٹے موٹے تھے مگر بے ڈھب نہیں لگتے تھے۔ سیاہ کاجل بھری آنکھوں میں تمناؤں کی چمک تھی۔ وہ قبول صورت اور خوش بدن لڑکی تھی۔ اور اُس کے سراپے کو قابل توجہ بنانے میں بڑا ہاتھ اس کی عمر کا تھا۔ جوانی تو گدھی پر بھی آئے تو اسے حسین بنا دیتی ہے۔ وہ بھی نظر کو خاصی بھلی معلوم ہوتی تھی اور پھر سمے کی بات ہوتی ہے۔

عام حالت میں جسے میں نے کبھی توجہ کے قابل نہ سمجھا تھا۔ رات کی اس تنہائی میں' ملگجی سی چاندنی میں جبکہ میں میں جذبات کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا' مجھے اس قبول صورت' عامیانہ طور اطوار کی مالک لڑکی میں جانے کیا کیا نظر آنے لگا۔ میں نفسانی جذبوں کی جس یلغار کا سامنا کر رہا تھا' اُس کے مقابلے کے لئے اس کا بھرپور شاداب و پرشباب سراپا گویا نعمت غیر مترقبہ محسوس ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں دھیمے لہجے میں بدستور اس کو اپنی گرم نگاہوں کی گرفت میں لئے خود سے بیگانہ ہو کر کہا۔ میری آواز میں لرزش تھی۔

میری نظریں اس کے وجود سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

وہ ہلکی پھلکی لان کے چست پھولدار شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ ململ کا باریک دوپٹہ پیڈسٹل فین سے نکلنے والی تیز رفتار ہوا کے جھونکے سے دوسرے ہی پل گردن سے لپٹ گیا تھا۔ وہ مجھ سے محض ایک فٹ کے فاصلے پر گنگ سی کھڑی تھی۔ اس کے بدن سے کسی سستے سے سینٹ کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

اس کا قاتل سراپا مجھے جذبوں کی رنگین و گستاخ داستان کہہ رہا تھا اور میری آنکھیں اس داستان کو پڑھ کر حنا رنگ ہوئی جا رہی تھیں۔

میرے جسم کی گہرائیوں میں سوئیاں سی ٹوٹنے لگیں۔ آنکھوں میں گلابی گلابی شرارے ناچنے

لگےاور کونوں میں ایسی سائیں سائیں ہونے لگی جیسے رگ و پے میں خون ابلنے لگا ہو۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا' میرے چہرے پر برستی آمادگی اور دیوانگی نے جیسے لمحوں میں اس کے اندر پرانی ماہرہ کو بیدار کر دیا تھا۔

جوانی کے منہ زور تقاضوں کے آگے ہتھیار ڈال کر پیاس بجھانے کو بے تاب و بے باک ماہرہ۔ نفس کے شکنجے میں نسوانی حیا اور حجاب کو جکڑ کر خواہشات کے سائے میں پناہ لینے والی ماہرہ۔

یہ الگ بات تھی کہ کہ آج اُس کی طلب سے لتھڑی وحشتوں کو بیدار کرتی ادائیں مجھے کراہیت آمیز نہیں لگ رہی تھی بلکہ اپیل کر رہی تھیں اس لئے کہ میں اس وقت صرف ایک مرد کی نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اخلاق و اقدار اور جائزہ ناجائز کی تفریق سے بے بہر بھوک مٹانے کو بے چین مرد۔

وہ میرے خاصے نزدیک آ چکی تھی۔

اتنی مدّت کی ذہنی و جسمانی اذیت' اعصابی شکستگی' تنزیلہ رحمٰن کی قربتوں سے محرومی' احساس ناکامی' بہت سارے عوامل تھے جن کے سبب میرے ضبط کی بندشیں ایک ایک کر کے تڑاخ سے ٹوٹتی چلی گئیں۔ میرے جسم کے اندر دھاکے سے ہونے لگے۔ وہ کچھ اس طرح دعوت نظارہ دینے والے' خواہشات کی تکمیل کے لئے اُکسانے والے بے باک انداز میں میری آنکھو کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھی کہ نگاہ بچانا اور خود کو بہکنے سے روکنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ اس لے سراپے میں انگاروں' شراروں اور بجلیوں کا ایک شہر آباد تھا جس کی تپش سے میرا ایمان خاک ہوا جا رہا تھا۔

ایک جوالا مکھی جیسے پھٹ پڑنے کے لئے قرار تھا۔ میری آنکھوں میں جذبوں کی انتہائی شدتیں مختلف رنگوں میں ایک تواتر سے اُترنے لگی تھیں۔ ہرے' نیلے' پیلے' لال' گلابی رنگ اور رنگوں کی اس حدت آمیز برسات میں میرا تن من بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ ہوش و حواش کی دنیا دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں بالکل خاموش کھڑا تھا۔ فقط نظریں بول رہ تھیں۔ اس کے سراپے کی پہنائیوں تک رسائی پان کی کوشش میں محو تھیں۔ وہ کچھ دیکھنا چاہتی تھیں جو ابھی پس پردہ تھا۔

''آ......آپ کو کچھ چاہئے تو نہیں؟'' وہ ایک فٹ کا درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے دیدہ دلیری سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔

اس کی نظریں بھی مسلسل میرے چہرے کا طواف کر رہی تھے

اُس کے انداز میں چھیڑ تھی' دعوت تھی' بہکا دینے والی نشہ چھلکاتی تپش تھی۔ میرا وجود بھڑک اُٹھا' رنگت شدت جذبات سے تمتمانے لگی۔

''ہاں۔'' میں نے جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے چنداں مزاحمت نہ کی۔

معاً سیڑھیوں پر کھٹکا سا ہوا اور میں آناً فاناً مدہوشی کی سرحدوں سے واپس پلٹ آیا۔

ہوش میں آتے ہی میں نے تیزی سے اسے جھٹک دیا۔

''تم جاؤ اب۔'' باوجود کوشش کے میرے لہجے میں سختی اور بیگانگی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ میں اس سے نظر ملائے بغیر اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے تیز تیز سانسوں کے درمیان بولا تھا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔

کیسی آنچ اُٹھی تھی دل سے کہ ذلت میں گرنے کو آمادہ ہو گیا تھا!!!!!

ماہرہ اپنا حلیہ درست کر کے بوجھل' مست نشیلے قدموں سے نیچے چلی گئی تھی۔ اور میں بیک وقت اضطراب' ملال' شرمساری اور تسکین و قرار کے جذباتسے دوچار ہو رہا تھا۔

سینے میں پگھلتا آتش فشاں بڑی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا' جیسا کہ تنزیلہ رحمٰن کی شوریدہ قربتوں میں بے تاب تمنائیں کافی حد تک پایہ تکمیل تک پہنچ کر سرشاری اور لذت کے در کھول دیا کرتی تھیں۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا پنکھے کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

ٹھنڈی ہوا نے کھولتے ہوئے جذبات کو بڑی حد تک پرسکون کر دیا۔

پھر میں پلنگ پر آ گیا اور ایک بھرپور انگڑائی لے کر بستر پر گر گیا۔

جذبوں کے سمندر میں اُٹھتا جوار بھاٹا خاموش ہو چکا تھا۔

اعصاب خاصے آرام میں محسوس ہو رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا' جیسے بڑی مدت سے چھائی پژمردگی اور تشنگی کی گرد چھٹ گئی ہو۔

تو اس کا مطلب ہے' واقعتاً اب دوسراہٹ کا تقاضا پوری شدّت سے سر اُبھار چکا ہے؟ اب سچ مچ نسوانی وجود میری ضرورت بن گیا ہے؟ آج اتنی مدت بعد عورت کا قرب پایا تو نئے سرے سے تازہ دم ہو گیا!! گویا نفس کی پکار پر لبیک کہنا میری مجبوری بن گیا ہے؟

اور یہ سوچیں مجھے عجیب سی اُلجھن میں مبتلا کر گئیں؟ کیا اس ''کمی'' یا ''محرومی'' کی وجہ سے ہی میں تنزیلہ رحمٰن کو اتنا مس کر رہا ہوں؟

مجھے ڈر لگنے لگا اپنی اس سوچ سے' دبے لفظوں میں اشارتاً بار ہا' تنزیلہ اکرام مجھے جتا چکی کہ میں درحقیقت تنزیلہ رحمن کے ریشمی بدن سے پیار کرتا ہوں او اُس کے حصول کے لئے اتنا بے قرار ہوں۔ کیونکہ اس کی بدولت کسی نہ کسی حد تک میری نفسانی خواہشات کی تسکین ہو جایا کرتی تھی اور اب اس سے بچھڑ کر اس تسکین کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ اسی وجہ سے میں اُس کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ محض اپنے نفس کے چارے کی خاطر!!! کیا واقعی ایسا ہے؟ تبھی تو ماہرہ کو بھی چارے کے طور پر گھسیٹ لیا' میں سراسیمہ ہو کر خود سے سوال کرتا تھا اور عجیب عجیب واہموں میں گرفتار ہوا جا دیا تھا۔

نہیں۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'

تنزیلہ رحمن کے لئے میں نے دنیا کی ہر خوشی خود پر حرام کر لی ہے۔ اس کے حصول کے لیے آگ کا سفر طے کیا ہے؟ اس کی محبت کی خاطر...... میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں بے پناہ محبت۔'' میں خود کو یقین دلانے لگا۔

ماہرہ کی طرف تو ہاتھ اس لئے بہکے تھے کہ وہ اُلو کی پٹھی خود ہی میرے ضبط کا امتحان لینے کو بے حجابانہ سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وگرنہ اس ٹھگنی چڑیل کو کون لفٹ کرواتا ہے۔ پھر وہ خود ہی تو مجھ پر مرمٹ رہی تھی۔ دیوانہ وار قربان ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے تھوڑی دعوت دی تھی۔ وہ تو خود سر تا پا دعوت بنی ہوئی تھی۔

میں طرح طرح کی تاویلوں سے کام لے کر ضمیر کو مطمئن کرنے لگا۔

دوسری صبح میں غیر معمولی طور پر خود کو فریش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

''ہیلو مادام۔! کیا ہو رہا ہے۔؟ میں تنزیلہ کو کھوجتا ہوا اس کے ڈیپارٹمنٹ میں آ گیا۔

''ارے'' خلاف توقع مجھے اپنے آفس میں اور بھی اس قدر خوشگوار موڈ میں دیکھ کر اس کا حیران ہونا فطری امر تھا۔

''خیر تو ہے۔ بڑے کھلے کھلے نظر آ رہے ہو۔''

''شکر ہے' آپ کی آنکھوں کو بھی ہماری کوئی خوبی نظر آئی۔''

میں شرارت آمیز نظروں سے اسے دیکھتا ہوا اُس کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ہم تو ترس گئے ہیں۔ آپ کی نگاہ ستائش کو۔ ایک عالم ہماری شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والی سحر انگیز پرسنالٹی پہ مرتا ہے مگر ''اِدھر'' ہم میں اور سیمنٹ کی بے جان دیوار میں کچھ فرق دکھائی نہیں دیتا۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں'' وہ قلم روک کر گالوں سے مس کرتی ایک لمحے کو بغور مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

''تم ماشاءاللہ بڑی بھرپور دلکش شخصیت کے مالک ہو۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''شکل وصورت میں تو خدا نے بڑی بے مثال فیاضی سے کام لیا ہے'' پھر وہ چھیڑنے کے سے انداز میں لب دبا کر مجھے دیکھنے لی۔ ''بس دماغ کے کچھ کل پرزے البتہ ڈھیلے رہ گئے ہیں۔''

''میں ناراض ہونے لگا ہوں''۔ میں نے بُرا مان جانے والے انداز میں دھمکی دی۔

''نہ بھئی' بزرگوں سے ناراض نہیں ہوتے۔'' اُس نے ناصحانہ انداز میں پچکارا۔

''بزرگ......'' میں نے تمسخرانہ نظروں سے اسے گھورا۔ ''واللہ' اس قدر دروغ گوئی۔''

''تم سے بڑی ہوں۔ اس لحاظ سے کم از کم تمہاری تو بزرگ ہوں ناں۔'' وہ فائل کے صفحے پلٹتی ہوئی بغیر چونکے مصروف سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''کوئی خاص بڑی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی سال اور وہ بھی کہاں لگتی ہیں۔''

میں نے اُس کے گڑیا سے اسمارٹ سراپے کو توصیفی نظر سے جانچا۔ ''جس سے مرضی چاہے فیصلہ کروالیں۔ دیکھنے والا یہی کہے گا کہ ہم دونوں ایک برابر ہوں بلکہ ہوسکتا ہے' کچھ کی رائے میں' میں آپ سے بڑا لگوں۔''

''بڑا لگنے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے میاں صاحبزادے'' وہ فائل کے مطالعے میں غرق ہوتے ہوئے بولی۔

''میں تم...... سے ٹھیک ٹھاک سینئیر ہوں اور اس کے ثبوت کے لئے آج سے میں تم سے آپا کہلوانا شروع کر رہی ہوں۔''

''میں نہیں کہتا' آپا واپا۔'' میں نے صفا جواب دے دیا۔ ''میں تو تنزیلہ ہی کہوں گا۔'' میں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

''شرم تو نہیں آئے گی۔'' اس نے تادیبی فہمائشی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ مجھے مطلق اثر نہ ہوا۔

''بالکل نہیں آئے گی۔'' میں نے ڈھٹائی سے کندھے اُچکائے ''تنزیلہ کہہ کر پکارنا مجھے کس قدر اچھا لگتا ہے۔'' میں جیسے کھوسا گیا۔ ''کتنا پیارا نام ہے ناں تنزیلہ'' میں نے اس کے نام کا ایک ایک حرف الگ سے بولتے ہوئے سرشار لہجے میں کہہ کر گہری سانس لے کر گویا اس کی مٹھاس اپنے اندر اُنڈیلنا چاہی تھی۔

وہ جواب میں خاموش رہی۔ اس وقت وہ اپنے کسی حساب کتاب میں بُری طرح اُلجھی ہوئی تھی۔ میرا جی اس سے باتوں کے لئے مچل رہا تھا۔

''سنیں۔ تنزیلہ۔'' میں نے بہت التجائیہ اور لجاجت آمیز انداز میں کہا۔

''اس خوبصورت نام کی لاج ہی رکھ لیجئے' اللہ کے واسطے دو منٹ کے لئے یہ فائلیں بند کردیں۔''

''بس پانچ منٹ اور...... میں یہ ایڈمن ڈیپارٹمنٹ میں بھجوادوں۔'' اس نے بڑی نرمی سے بغیر کسی جھلاہٹ اور کوفت کے آرام سے کہا۔ ''مجھے ایک عزیز کی عیادت کے لئے پمز اسپتال جانا ہے۔ دونوں اکٹھے نکل جائیں گے۔ راستے میں جی بھر کے باتیں کر لینا۔''

اور میں اطمینان سے کرسی سے ٹیک لگائے' اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چند ساعت بعد اچانک گلاس ڈور کھلا اور ابتصار بھائی اندر چلے آئے' میں کچھ خفیف سا ہو گیا۔ آج صبح صبح وہ لاہور سے واپس آئے تھے اور چھٹی کرنے کے بجائے محض دو تین گھنٹے آرام

کے بعد آفس چلے آئے تھے۔

ان کی چبھتی ہوئی مستفسرانہ نگاہ مجھ پر جم گئی تھی۔

''او...... آپ...... تشریف لائیے۔'' تنزیلہ نے فائلوں سے سر اُٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئی رسمی جوش و خروش کا اظہار کرتے ہوئے متانت سے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے۔ تحریم تم نے طارق صاحب کے لیٹرز کمپوز کر لئے؟''

انہوں نے بلا کے سرد و سپاٹ لہجے میں باری باری ہم دونوں کا چہرہ جانچا تھا۔ میرا رنگ اُڑ گیا۔ کام کے معاملے میں وہ کسی قسم کی رعایت دینے کے عادی نہیں تھے۔

''دراصل مجھے اس سے کچھ ضروری کاغذات کمپوز کروانے تھے۔ اسی لئے اسے بلوایا ہے۔ سر کو شام تک بھجوانے ہیں۔ میرے کام کے بعد شام کو یہ آپ کا کام کر دے گا۔''

مجھے شش و پنج میں پڑا دیکھ کر اُس نے نہایت سہولت سے صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

ابتصار بھائی کے کھینچے ہوئے منجمد تاثرات پگھلنے لگے۔

''کوئی بات نہیں۔ میں اس کی سیٹ خالی دیکھ کر اسے تلاش کرتا ہوا ادھر نکلا تھا۔'' انہوں نے تنزیلہ سے رواداری سے کہا تھا مگر اُن کی نظروں میں میرے لیے سلگتی ناگواری چھپائے نہیں رہی تھی۔

میں اُن کی کیفیات سمجھ رہا تھا۔

وہ مجھے تنزیلہ کے آفس میں اس طرح گھل مل کر بیٹھے دیکھ کر آتش زیرپا ہو رہے تھے۔

''فارغ ہو کر کام کرنے کو جی چاہے تو آجانا۔'' وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے بظاہر سپاٹ انداز میں کہہ کر فوراً باہر نکل گئے مگر ان کے لب و لہجے میں بلا کی کاٹ اور تیکھا پن تھا۔ جسے محسوس کر کے تنزیلہ نے آہستگی سے مری طرف رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہے تحریم کہ میں خود ہی اسپتال سے ہو آتی ہوں۔ تم ان کا کام کر دو۔''

کیوں' خواہ مخواہ۔'' میں برہمی سے اُسے دیکھتا ہوا بولا۔ ''واپسی پہ کر دوں گا اور پھر آپ نے کہہ تو دیا تھا کہ شام تک میں آپ کے ساتھ بزی رہوں گا۔''

''پھر بھی تمہیں ذمے داری کا ثبوت دینا چاہیے۔ خبر ہے' کتنی مشکلوں سے دوبارہ جاب ملی ہے۔''

''تو کیا ہوا......'' میں تنک کر رہ گیا۔ ''ایسی ہزار نوکریاں میرے قدموں میں پڑی رہتی

ہیں۔ میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں۔" میرا جوان خون شریانوں میں ہلچل مچانے لگا۔ غصّے سے رگیں تن گئیں۔

"بے وقوفوں والی باتیں مت کرو" اس کی نظر میں سرزنش تھی۔

نوکریاں سڑکوں پر نہیں اُگتیں جو تم جھٹ سے توڑ لاؤ گے۔ یہ اسلام آباد ہے۔ کوالیفیکشن اور ایکسپیرینس کے بغیر یہاں دال نہیں گلتی۔ خالی خولی پرسنالٹی کی چمک سے کچھ نہیں بنتا۔"

اس نے دبے لفظوں میں مجھے احساس دلایا تھا کہ میں محض اپنی طلسمی مقناطیسی شخصیت کے بل بوتے پر کامیابی حاصل نہیں کرسکتا اور یہ سوچ محض خوش فہمی ہے اور کچھ نہیں۔

میں بے نیازی سے مسکرایا۔

"آپ ان صاحب سے کیوں خائف ہیں؟"

"خائف نہیں ہوں۔ اپنی عزت کے لئے محتاط رہنا چاہتی ہو۔ تم اُس کی فطرت سے واقف نہیں ہو ناں۔ اس لئے اتنے آرام سے کہہ رہے ہو۔ سانپ میں بھی کیا زہر ہوگا جو اُس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ بہت شاطر آدمی ہے جو کبھی لڑتا ہے اور دشمنی میں بالکل حیوان بن جاتا ہے۔" وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"اونہہ۔ بہت دیکھے ہیں ایسے۔" میں نے تحقیر سے سر جھٹکا۔ "میں بھی انتقام لینے میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ موصوف مجھ سے تیز نہیں ہوں گے۔ مجھ سے اُلجھنے والا شخص اپنی سلامتی کی خیر مناتا پھرتا ہے۔ یہ تو میں یونہی آپ کے سامنے بچہ بن جاتا ہوں۔ اچھا لگتا ہے آپ سے ڈانٹ کھانا' ناز اُٹھوانا' اور لیکچر سننا' آپ نے میرا اصل روپ نہیں دیکھا۔ کوئی مجھے چوٹ دے کے جائے گا کہاں۔"

"بس کرو۔ سلطان راہی والی یہ بڑکیں' انہی فلمی سیٹ تک ہی محدود رکھو' عملی زندگی میں کہیں کام نہیں دیتیں۔"

اس نے میرے تیوروں کا نوٹس نہ لیتے ہوئے اس طرح تادیبی نگاہ مجھ پر ڈالی جیسے میرے انداز کو بچکانہ احساس برتری پر محمول کر رہی ہو۔ میں جھنجھلانے لگا۔

"آپ انہیں بڑکیں سمجھ رہی ہیں؟ دیکھ لیجئے گا۔ ایک دن آپ پر حقیقت کھل جائے۔" میں نے زور سے ہتھیلی پر مکا مارا۔

"ٹھیک ہے۔ تم بھی یہیں ہو اور میں بھی۔" وہ میرا جوش و جلال نظر انداز کرتی ہوئی کرسی

دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ اب چلیں اسپتال دیر ہو رہی ہے۔"

"جائیں گے کیسے؟" میں اس کے ہمراہ سیڑھیاں اترتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"گاڑی ہے میرے پاس۔" نیچے پارکنگ لاٹ میں کھڑی نیلی سوزوکی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے مجھے جواب دیا۔

"تمہارا آگے کیا ارادہ ہے تحریم؟" میں فرنٹ سیٹ پر اُس کے ہمراہ بیٹھ گیا تو اس نے گاڑی چلا دی۔

ہم لوگ فضل الحق روڈ پر نکل آئے تھے۔

"ارادے کیا ہونے ہیں۔" میں تساہل سے سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر لمبی سانس لی۔ "جس طرح گزر رہی ہے' گزار رہے ہیں۔ زندگی سے تو بس ایک ہی شے طلب کی ہے۔ وہ مل جائے تو سارا جہاں مل جائے گا۔"

"وہ تو سب نصیب کی باتیں ہے اگر تمہارا انجوگ اُس کے ساتھ لکھا گیا ہے تو ضرور مل جائے گی مگر میں تمہارے مستقبل کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ آخر تم نے کچھ تو سوچا ہوگا' اپنے فیوچر کے بارے میں' کیا بننا چاہتے ہو؟ کس مقام تک پہنچنا چاہتے ہو۔ کیا پلاننگ ہے۔ ظاہر ہے' اس معمولی سی جاب پر تو تکیہ نہیں کرو گے ناں۔ وہ بھی ایسی جاب جس کی کچھ Surity نہیں۔ آج ہے کل شاید نہ ہو' اپنے کزن کے تیور تمہارے سامنے ہیں۔ جانے کیوں میری چھٹی حس یہ الارم بجا رہی ہے کہ انتصار تمہارے خلاف کوئی اقدام ضرور کرے گا۔ اس کی آنکھوں میں آج میں نے تمہارے لئے بہت غیظ اور تلخی بھری ہوئی دیکھی ہے۔ کوئی بات ہے ضرور۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ تمہارے خلاف بھرا بیٹھا ہو۔"

"میں اُن کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔" میں نے دل ہی دل میں اہانت محسوس کرتے ہوئے اس تاثر کو مٹانے کے لئے تندی سے کہا۔

"یہ کوئی خاص بات نہیں۔ ہم زندگی میں بہت سے لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اُن سے نفرت کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو اپنی نظروں سے اوجھل دیکھنا چاہتے ہیں مگر ایسا نہیں کر پاتے کہ اپنا ماحول بدلنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ ہم اُن سے ربط ضبط بڑھانے اور انہیں برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی میں بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم صرف برداشت کرتے ہیں۔ دھتکار اس لئے نہیں سکتے کہ ہمیں ان کے درمیان رہنا ہوتا ہے۔"

وہ کامپلکس اسپتال کے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے گاڑی پارک کرنے کے لئے انٹری سلپ لے کر مجھے تھماتے ہوئے بولی۔

''اپنی جیب میں رکھ لو۔ مجھ سے تو یہ ادھر اُدھر ہو جاتی ہے۔''

''کہیں اپنے مقدر کا بندہ بھی ادھر اُدھر نہ کر دیجئے گا۔'' میں شرارت آمیز نظروں سے گھورتا ہوا مسکرایا۔

خلاف توقع اس فقرے پہ مسکراہٹ اُچھال کر محظوظ ہونے کے بجائے وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔ اس کے چہرے سے گمبھیرتا جھلکنے لگی۔ تاثرات ایک دم جامد ہو گئے تھے۔ مگر یہ دورانیہ لمحاتی تھا پھر وہ سر جھٹک کر نارمل انداز میں گاڑی پارک کر کے باہر نکل آئی۔

''آیئے کہیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں ریسٹورنٹ وغیرہ میں۔ لنچ بھی کر لیں گے۔''

وہ پرائیویٹ وارڈز کی رو میں اپنے مطلوبہ کمرہ نمبر میں داخل ہوئی تو میں باہر کھڑا اُس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ واپس ہوئی تو میں نے اُس کے ہم قدم چلتے ہوئے کہا۔ ''لنچ کا ٹائم تو ہو رہا ہے۔''

اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سمت دیکھا ''ایسا کرتے ہیں کسی ہوٹل سے کھانا پیک کروا لیتے ہے۔ آفس میں جا کر کھا لیں گے۔'' نجانے کیوں وہ ہوٹل میں لنچ کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

''آفس میں کیا خاک مزہ آئے گا۔'' میں نے برا سا منہ بنایا۔ ''یہیں بیٹھ کر کھاتے ہیں''

''دراصل مجھے یہ سب مناسب نہیں لگ رہا۔'' وہ کچھ دیر کے توقف کے بعد جزبز سی ہو کر بولی۔ ''مجھے آج تک کسی نے کسی مرد کے ساتھ گھومتے پھرتے یا ہوٹلنگ کرتے نہیں دیکھا۔ اگر کسی جاننے والے کی نظر پڑ گئی تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اب ہر ایک سے تو ہم جا کے وضاحت نہیں کر سکتے ناں کہ ہم ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔ پھر انتصار صاحب نے دیکھ لیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ وہ اس وقت باہر کے چکر پر ہوتے ہیں اور لنچ کے لئے اکثر بلیو ایریا کے ہوٹلز میں پائے جاتے ہیں۔'' وہ متامل ہو کر کہنے لگی۔

میرے ہونٹ بھینچ گئے۔

''میرے بھی بہت جاننے والے ہوں گے مگر مجھے تو ایسی کوئی سوچ پریشان نہیں کر رہی؟''

میں نے پچھلے دنوں ٹی وی پروڈیوسر ناصر حیات سے مل کر اُس کے سیریل میں کام کرنے کی

ہامی بھر لی اور آج کل شام میں فارغ ہو کر اس کے ہوٹل کی لابی میں پایا جاتا تھا۔ اسی حوالے سے میں نے کہا تھا۔

''اس لئے کہ تم ایک مرد ہو۔'' اُس نے میرے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ لہجہ کسی حد تک طنزیہ تھا۔ ''اور یہ معاشرہ بھی مردوں کا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد کے گناہ پتھر کی طرح ہوتے ہیں جو وقت کی جھیل میں گر کر نیچے تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس عورت کے گناہ پھول کی طرح وقت کی جھیل کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں چنانچہ سب کی نظر میں آ جاتے ہیں''

''پلیز..... نو لیکچر۔'' میں نے عاجز آ کر ہاتھ جوڑ دیے۔

''آپ نے خود کو اتنے موٹے خول میں لپیٹ رکھا ہے کہ انسان چاہے بھی تو آپ تک رسائی نہیں پا سکتا۔ یہ خود ساختہ خول کبھی تو خود سے ہٹا دیا کریں۔''

''جسے تم خول کہتے ہو میں اسے حفاظتی باڑھ کا نام دیتی ہوں۔''

''آپ اس حصار میں ایک دن دم گھٹنے سے مر جائیں گی۔''

میں نے قدرے بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں کبھی نہیں۔ یہ خول مجھے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی تو بھیڑیا نما انسانوں کو حدِ فاصل تک محدود رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ تکلف' احتیاط' اجنبیت اور سرد مہری کا یہ خول اُتار دوں اور حد فاصل توڑ ڈالوں تو پھر میں اپنی عزت و حرمت اور نسوانی حیا و حمیت کو بچا کر گھر نہ جا سکوں گی۔ اگر مجھ جیسی عورت اپنی انا۔ اور مضبوط مستحکم قوتِ ارادی کی حدود ختم کر ڈالے تو تمہارے اس مہذب معاشرے کے لوگ گدھوں کی طرح اس کا گوشت نوچنے کے لیے جھپٹ پڑیں گے۔ سڑکوں' بازاروں میں مردوں کے میدان کارزار میں نکلنے والی خواتین کو قدم قدم پر عورت خور مرد ٹکراتے رہتے ہیں۔''

''یا خدا!'' میں دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''لنچ کا ٹائم ہے اور ایسے میں گدھوں' عورت خوروں اور پتھروں پھولوں کی باتیں یقین کیجئے' ساری بھوک اُڑا دیں گی۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ میں سچ مچ انسانوں کے کھانے کے لائق غذا کھانا چاہتا ہوں۔''

''چل رہے ہیں بھئی ہم ''عثمانیہ ہوٹل'' وہاں سے لے لیتے ہیں۔ بڑے عمدہ دیسی کھانے ہوتے ہیں وہاں کے۔ خاص طور لنچ اور ڈنر۔ ویسے انسان ایک دوسرے کا سر بھی بڑے شوق سے

کھاتے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو......''

گاڑی عثمانیہ کے سامنے پارک کرتے ہوئے وہ تسلی آمیز لہجے میں بات کرتے کرتے آخر میں یکلخت لطیف سی شرارت کر گئی تھی۔

''جی نہیں۔ وہ ڈش میں راستے میں بہت کھا چکا ہوں'' میں نے بظاہر چڑ کر مگر بظاہر محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔

باوجود اصرار کے وہ ہوٹل میں بیٹھ کر لنچ کے لئے آمادہ نہیں ہوئی۔ ریسپشن پہ جا کر ہم نے مینو پڑھ کر انتخاب کے عمل سے گزرنے کے بعد آرڈر دے دیا۔ تقریباً بیس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ پیک شدہ کھانا گاڑی میں رکھوا کے جب وہ پے منٹ کرنے لگی تو میں نے اس سے پہلے ہی والٹ نکال کر ادائیگی کر دی۔

''یہ کیا حرکت ہے بھئی۔ یہ لنچ میری طرف سے تھا'' گاڑی میں بیٹھ کر وہ جھگڑنے لگی تھی' چہرے پر غصہ جھلک رہا تھا۔

''جب مرد ہمراہ ہو تو عورت پے منٹ کرتے جچتی نہیں ہے۔''

''بہت پیسے ہیں کیا تمہارے پاس'' وہ ڈپٹنے لگی۔ یقیناً میری تنخواہ کے حساب سے کہہ رہی تھی۔ ابھی پرسوں ہی مجھے پہلی تنخواہ ملی تھی۔

''ابھی پورا مہینہ پڑا ہے۔ ابھی سے عیاشیوں میں اُڑا دئے تو پھر آگے مصیبت پڑ جائیگی۔'' وہ بڑوں کیطرح مجھے سمجھا رہی تھی۔

پھر ایک دم کسی دھیان سے چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''اور یہ تم مرد کب سے بن گئے۔ جو اپنے ''فرائض'' نبھانے لگے۔ ابھی خیر سے تم...... چھوٹے اور نادان' کم عمر لڑکے' ایک بے وقوف سے چھوٹے بھائی ہو۔'' وہ ڈانٹ کر کہہ رہی تھی۔

''اب اتنا بھی چھوٹا نہیں ہوں۔'' میں نے خم ٹھونک کر اکڑ کر کہا۔ ''آپ میرے سامنے چھوٹی لگتی ہیں البتہ مگر جناب ہم اللہ کی شان سے مرد ہیں' سرتاپا اور اپنی مردانگی پر ہمیں ناز ہے۔''

وہ غصہ بھول کر ہولے سے مسکرا دی۔ وہ بہت کم ہنستی تھی۔ مسرت کے اظہار کیلئے وہ زیادہ تر مسکراہٹ کا استعمال کرتی تھی مگر اس کا پورا سراپا مسکراتا ہوا سا لگتا تھا۔ وہ ہمہ وقت بشاش اور فریش نظر آتی تھی۔ اس کی ایک ایک ادا میں تبسم ریزی اور خوشدلی جھلکتی تھی۔ بہت کھلا کھلا سا رہتا تھا اُس کا موڈ مگر اس کے باوجود مرد ورکرز کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یا ڈیلنگ کرتے ہوئے مقابل اُس

کے چہرے اور آنکھوں سے ہویدا تنبیہہ اور فاصلوں کو جنم دیتی سرد مہری کا بخوبی احساس کر سکتا تھا۔ وہ فاصلوں سے رہنے کا فن بہت اچھی طرح جانتی تھی اور بہت خوبصورتی سے وہ اپنائیت اور اجنبیت کے درمیانی فرق کا خیال رکھتی تھی۔

''کسی سے ملتے ہوئے میں یہ نہیں دیکھتی کہ اگر وہ مرد ہے تو اس میں کتنی مردانگی ہے یا عورت ہے تو اس میں کتنی نسوانیت ہے۔ میں صرف یہ دیکھتی ہوں کہ بحیثیت ایک انسان اس میں کتنی انسانیت ہے۔ یعنی وہ کس حد تک انسان کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یاد رکھو' پہلے ہم انسان ہیں پھر مرد یا عورت ہونے کے دعویدار بنتے ہیں اور سچ پوچھو تو مرد یا عورت بننا کون سا انسان کا اپنا ذاتی کمال ہے' یہ تو خدائی کام ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت تو اس دنیا میں بہت ہوتے ہیں' ہاں انسانیت کے درجے پر اُن میں سے کوئی کوئی ہی فائز ہوتا ہے۔''

انسانیت کے درجے تک پہنچنے کے لئے کن اوصاف حمیدہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ذرا لگے ہاتھوں اس کی وضاحت بھی فرما دیجئے؟''

میں نے دل میں اس کے اس درجہ ستھرے خیلات سے متاثر ہوتے ہوئے بظاہر ہلکے پھلکے چھیڑ کے سے انداز میں پوچھا۔

''اس کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ احساس' اخلاص اور ایثار۔ احساس اس وقت بیدار ہوتا ہے' جب نفس پر کنٹرول ہو' نفس پر قابو پانے سے دل خالص ہو جاتا ہے اور جب دل میں اخلاص ہو تو وہ دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کے جذبوں کو اُبھارنے کا باعث بن جاتا ہے۔ کسی شاعر نے پتے کی بات کہی ہے کہ۔

آدمی سے انسان تک آ گئے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ہوتی

یعنی آدمی تو اپنی یا اپنی عزیز ترین ہستیوں کی غرض و غایت اور مفاد کے بارے میں سوچتا ہے' جبکہ ایک انسان قطعی بے غرض اور بے ریا ہوتا ہے۔ وہ سب کی مجموعی بھلائی کا سوچتا ہے۔ وہ مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئی خود اپنا نقصان گوارا کر لیتا ہے مگر سروں کو خسارے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ خود بھلے سے اندھیروں میں رہے مگر دوسروں کے گھروں کو روشنیوں سے بھر دیتا ہے۔ اور یہی معراج انسانیت ہے کہ خود سے بڑھ کر' اپنے نفس کے تقاضوں سے بالاتر ہو کے دوسروں کے لئے چراغ راہ فراہم کیا جائے' دوسروں کی فلاح کو عزیز رکھا

جائے۔"

"خود بھلے سے جائے بھاڑ میں۔ یعنی اپنا اور اپنے بال بچوں کا ستیاناس ہو جائے بے شک۔" میں نے بھویں اُچکا کر حیرت ظاہر کی۔

"نہیں...... جو شخص خلق خدا کا خیال رکھتا ہے' خدا اور اس کی مخلوق بھی اسے عزیز رکھتی ہے۔ اس سے پیار کرتی ہے' اس کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ بھلا نیکی کا بدلہ نیکی کے ماسوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کے بندوں کے کام آتے ہیں۔ دوسروں کا بھلا کرتے ہیں۔ حضرت ابو بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ کا قصہ نہیں پڑھا تم نے؟ کتنا بڑا سبق ہے اس میں ہمارے لئے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے شعر میں اسی واقعے کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں' بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ کا بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

تو میرے عزیز! یہی ہے کل حقیقت۔ نیکی کا بدلہ نیکی ہے بدی کا بدلہ بدی۔"

گاڑی اسٹار کو کمپنی کی عمارت کے پارکنگ لاٹ میں رُک گئی تھی۔ اور جب میں پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کھانا نکال رہا تھا عین اسی لمحے لتصار بھائی باہر نکلے تھے۔ انہوں نے بہت گہری نظر سے ہم دونوں کا جائزہ لیا اور پھر سر جھٹک کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئے۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا میں نے کندھے اُچکاتے ہوئے بے فکری ظاہر کی مگر تنزیلہ کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں بن گئی تھیں۔

❤❤❤

"ماہرہ۔ فارغ ہو کے اوپر آنا' تم سے کچھ کام ہے۔"

شام کی چائے ڈرائنگ روم میں سب کے ہمراہ پی کر میں کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے چولہے کے پاس کھڑی ماہرہ سے موقع پا کر سرگوشی میں بولا اور پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اوپر آ گیا۔

کوئی دس منٹ بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ماہرہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرشاری اور مخموری سی بیتابی کی لپک تھی۔ اُس کے خیال کے مطابق میرے بلانے کی یہ دعوت اُس روز کی "دعوت" سے مختلف تھی۔

مگر میرا موڈ اس وقت خاصا گمبھیر ہو رہا تھا۔ اٹکھیلیاں کرنے اور شوخ جسارتیں کرنے کی نہ طلب تھی اور نہ طبیعت مائل ہو رہی تھی۔ میں اس وقت بہت اُلجھا ہوا تھا اس لئے اُس کے کرسی پر بیٹھتے ہی میں دو ٹوک انداز میں شروع ہو گیا۔

"ماہرہ! جب سے لتصار بھائی تایا جی کے ہمراہ لاہور سے واپس لوٹے ہیں' اُن کا مزاج بہت بگڑا ہوا سا ہے۔ کچھ خبر ہے تمہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی؟" میرے ماتھے پر تفکر کی کی لکیریں بچھی ہوئی تھیں۔ بھوئیں سکیڑے میں متردد سا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا' میرے سنجیدہ چہرے اور سوال نے جیسے ماہرہ کے ارمانوں سے بھرے وجود پہ اوس گرا دی تھی۔

"دراصل۔ اُدھر گاؤں میں اُنہیں عجیب عجیب باتیں سننے کو ملی ہیں۔" وہ اپنی کاجل بھری آنکھیں ایک ادا سے گھماتی ہوئی جواب میں بولی۔

"کیسی باتیں.....؟" میں اس کی اداؤں کی نمائش سے قطع نظر جلد از جلد صورت حال کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ سو بے صبری سے قدرے ناخوشگوار نگاہ اُس پر ڈال کر ضبط کرتا ہوا بول اُٹھا۔

"بھائی جان کے رشتے کی بات چل رہی تھی' کسی ممبر قومی اسمبلی کی بیٹی سے' مگر پھر اچانک ادھر سے جواب مل گیا۔ گاؤں گئے تو وہاں سے پتا چلا کہ اس رشتے کو تڑوانے میں اختر چچا (میرے ابا جان) اور چچی کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے کہیں ایم این اے کے گھر والوں کو اطلاع دے دی تھی کہ جس لڑکے کو اپنی بیٹی دینے کا سوچ رہے ہیں' وہ ایک نمبر کا شرابی اور عورتوں کا دلدادہ ہے۔ پھر کچھ اور باتیں بھی کیں جن سے وہ لوگ بدظن ہو گئے اور رشتہ طے ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

"اوہ!" میں نے گہری سانس لی۔

ساری صورت حال آناً فاناً کھل گئی تھی۔ تو گویا ان کے پرسوں کے طرز عمل کے پیچھے یہ غصہ اور بدگمانی پوشیدہ تھی۔ تنزیلہ صحیح کہہ رہی تھی کہ کوئی بات ضرور ہے جو اُن کی نظروں میں غیظ اور تلخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ رشتے کے معاملے میں اعتصار بھائی کی جو گت بنی تھی' اس خبر سے مجھے تسکین سی محسوس ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے' اس صورت حال میں وہ مجھ سے متنفر نہ ہوتے تو اور کیا کرتے پھر دوسرا تنزیلہ اکرام جیسی بااختیار اور بارعب شخصیت کا مجھ سے غیر معمولی التفات و اکرام بھی ان کی نظروں میں چبھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ پس پردہ ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ سے اعتصار بھائی آفس میں پچھلے دو ہفتوں سے سخت بری طرح مجھ سے خائف ہو رہے تھے۔ دو ہفتے قبل انہوں نے عادت کے مطابق سیکریٹری کے جاب چھوڑ کر جانے کے بعد ایک نئی سیکرٹری تبسم کی اپائنٹمنٹ کی تھی۔ نام تو اس لڑکی کا تبسم تھا مگر وہ سرتاپا شعلہ تھی۔ اس کا حسن حشر ساماں اور فتنہ انگیز تھا۔ اعتصار بھائی حسبِ معمول اُس کے جلا راکھ کر دینے والے حسن پر مر مٹے۔ ہر طرح سے جال پھینک کر اسے لبھانے رجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس محترمہ کا اتفاقاً مجھ سے ٹاکرا ہوا تو وہ میری ہوشربا شخصیت سے متاثر ہو گئی اور آئے دن موقع پا کے کمپیوٹر روم میں آ دھمکتی۔

اس کا میری طرف والہانہ جھکاؤ اعتصار بھائی کی زیرک نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا اور یہ آگہی اُن کے تن بدن میں آگ لگا گئی۔ خود پسند شخص کبھی بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اسے نظرانداز کر کے دوسرے شخص کے سر پر دستارِ فوقیت رکھ دی جائے۔ یہ بات طے تھی کہ وہ عمر کے جس حصے میں پہنچ چکے تھے وہاں سے جوانی دبے پاؤں رخصت ہونے کی تیاریاں پکڑتی ہے۔ ان کا اسمارٹ جسم کوشش کے باوجود عمر کے ساتھ ساتھ ڈھلکنے لگا تھا۔ چہرے پہ کچھ تو عمر کے سبب اور کچھ اپنے کرتوتوں کی بدولت پکا پن نمودار ہو گیا تھا۔ گوشت نیچے لٹک جانے پر آمادہ تھا۔ ان کی خفیف سی دوہری ٹھوڑی اور ماتھے کی گہری پڑتی لکیر عمر کی چغلی کھانے لگی تھی۔

اُن کے مقابلے میں' میں ابھی عہد شباب میں داخل ہوا تھا اور سرتاپا بھرپور فٹ فاٹ ایک دم سولہ آنے تریب دار مردانہ خوبصورتی کا مالک تھا۔ میں نے اکثر محسوس کیا تھا کہ وہ گہری نظروں سے میرے جسم کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ اُن کی نظر میں رشک' حسد' اور جلن کے ساتھ ساتھ کچھ عجیب سے سرد طول سے مایوس کن تاثرات درج ہوتے تھے۔ شاید وہ اپنا اور میرا جسمانی تقابل کرتے تھے۔ اور اس جائزے کے بعد وہ اندر ہی اندر اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور گھٹتی ہوئی جسمانی کشش کے احساس کی آگہی کے بعد کو خوفزدہ ہو جاتے تھے اور ردعمل کے طور پر اُن کے دل میں میرے لئے نفرت جاگ اُٹھتی تھی۔

غرض یہ کہ بہت سے عوامل تھے جن کے سبب وہ کچھ عرصے سے مجھ سے رکھائی اور بدلحاظی برتنے لگے تھے اور اب ان میں ایک اور اضافہ ہو گیا تھا۔

"کس سوچ میں رہے ہیں آپ؟" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف تکتے ہوئے بڑی دیدہ دلیری سے مسکرا رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" جونہی میں اُٹھا' وہ میرے سامنے آ گئی۔

"ہٹو راستے سے۔" میں نے بیزاری اور رکھائی سے کہتے ہوئے اسے ہاتھ سے پرے ہٹانا

چاہا۔ ماہرہ نے میرا ہی ہاتھ تھام لیا۔

عین اسی لمحے دروازہ کھلا اور پھر جیسے ہم دونوں دھک سے رہ گئے۔ انتصار بھائی چوکھٹ پر کھڑے تھے۔

ماہرہ بجلی کی سی تیزی سے اپنا ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہو گئی۔ میں اس سے پہلے ہی جست لگا کر پرے ہٹ چکا تھا۔ خبر نہیں انتصار بھائی پورا ''سین'' دیکھ چکے تھے کہ صرف ہمیں ایک دوسرے کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔

بہرحال کچھ دیکھا ضرور تھا جو ان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے درشت نظروں سے ماہرہ کو گھور کر دبے لہجے میں پوچھا۔ اُن کا انداز بلا کا سرد تھا۔

ماہرہ کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ اُس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ انگلیاں مروڑتے ہوئے اُڑے اُڑے حواس مجتمع کرنے کی کوشش میں وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ بڑے بھائی کا مشتعل خونی موڈ دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کے دل میں چور تھا ورنہ پوزیشن تو ''قابلِ اعتراض'' نہیں تھی۔ ایسے اتفاقات اکثر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کچھ پکڑنے دینے لینے کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک آ ہی جاتا ہے بندہ اور سب لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے بھی ایسا اتفاق ہوتا رہتا ہے اور قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

ماہرہ دبے قدموں سے سر جھکائے تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

''آیئے انتصار بھائی۔'' میں نے خود پر قابو پا کر نارمل سے انداز میں کہا۔

انہوں نے بہت گہری نظر سے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور پھر ہونٹ چباتے ہوئے کچھ دیر بعد بولے۔ پیشانی ہنوز شکن آلود تھی۔

''تم نے کچھ عرصہ پہلے ذکر کیا تھا کہ تمہارا کوئی دوست یہاں رہتا ہے فلیٹ میں۔ اس نے تمہیں بھی کئی بار آفر کی ہے اپنے ساتھ رہنے کی۔ اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو بے شک اُس کے ساتھ

شیئر کر لو۔ ویسے بھی وہاں سے تمہیں زیادہ آسانی رہے گی آنے جانے میں۔''

کچھ عرصہ پہلے جب میں نیا نیا یہاں آیا تھا تو میرا جگری دوست حق نواز شاہ نے بہت کہا تھا فلیٹ میں اُس کے ساتھ رہنے کو مگر تائی نوراں اور تایا اکبر نے صاف کہہ دیا تھا۔ ''جب اپنا گھر موجود ہے تو کرائے کے فلیٹ میں کیوں رہنا۔'' اس وقت لاڈ پیار کے اور ہی انداز تھے۔ مگر اب دیباچہ بدل گیا تھا۔

ویسے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہونا تھا۔ یوں بھی ماہرہ کی اُلٹی سیدھی حرکات سے تنگ آ کر میں نے بہت پہلے شاہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا تھا مگر تایا اور تائی نے پیش نہیں جانے دی تھی مگر اب جس لحاظ سے اور جس وجہ سے انتصار بھائی نے مجھے گھر چھوڑنے کا عندیہ دیا تھا۔ اس سے میں بہت توہین محسوس کی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ ظاہر تو یوں کر رہے تھے جیسے خود بڑے پارسا ہوں۔ دوسروں کی لڑکیوں کی سمت دست ہوس بڑھاتے ہوئے تو کبھی یہ غیرت نہیں آئی' آج کسی کو اپنے گھر کی لڑکی سے چہلیں کرتے دیکھ کر جلال اُمنڈ آیا تھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر جا چکے تھے۔

''اونہہ۔ بڑے غیرت مند بنے پھرتے ہیں'' میں نے کرسی کو ٹھوکر مارتے ہوئے پھنکار کر سوچا تھا۔

♥♥♥

اس واقعے کے محض تین روز بعد ایک اور دھماکا ہوا۔ میں کمپیوٹر روم میں بیٹھا انتصار بھائی کی دی ہوئی ڈکٹیشن کمپوز کر رہا تھا' جب پھٹ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

''ایکس کیوزمی۔ تحریم صاحب لیٹر کمپوز ہو گیا؟'' ایک سریلی شیریں آواز کان میں پڑی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' سرخ ویلوٹ کے آتشیں لباس میں شبنم لچکتی ہوئی میری سیٹ کے قریب آئی تھی۔ آ کر وہ میرے بالکل برابر رکھی کرسی پر نزاکت سے بیٹھ گئی' کچھ اس طرح کہ اُس کے وجود سے پھوٹتی خوشبوئیں میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے جز بز ہو کر غیر محسوس طریق سے اُس سے حتی الوسع پرے ہونے کی کوشش کی۔

''بس تھوڑا سا رہتا ہے۔'' میں نظر ملائے بغیر پرنٹ آؤٹ نکالتا ہوا آہستگی سے بولا۔

''لائیے' میں آپ کو بول دیتی ہوں' آپ کمپوز کرتے جائیں۔'' وہ میرے ہاتھ سے اوریجنل لیٹر لے کر دلکش لب و لہجے میں انگلش میں لکھا گیا لیٹر ڈکٹیٹ کرانے لگی۔ میں کچھ کہنے یا کرنے سے قاصر تھا سو چپ چاپ اپنے کام میں لگ گیا۔

''ایک منٹ۔ یہ لفظ ڈیپوٹیشن ہے' ریپوٹیشن نہیں۔'' معاً وہ مجھ سے قریب تر ہو کر کی بورڈ پر حرکت کرتی میری انگلیاں چھو کر کہنے لگی۔

اس کے لمس نے عجیب سے احساسات سے دوچار کر دیا۔ مجھ پر خمار سا چھانے لگا۔ وہی مرد کی ازلی کمزوری۔

''تحریم صاحب! شام کے اوقات میں آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟'' کچھ توقف کے بعد اس نے بادل ناخواستہ میری انگلیاں اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا۔ اس سوال کے پس پردہ مطالب و معانی سے میں بخوبی واقف تھا۔

''میں آج کل ایک ٹی وی سیریل میں کام کر رہا ہوں' اس کی ریہرسل میں بزی ہوتا ہوں۔''

''واقعی سو سویٹ...... آپ دیکھنے میں ایک ہیرو ہی کی طرح ڈیشنگ اور سمارٹ لگتے ہیں۔''

اس نے فرطِ اشتیاق سے آنکھیں میچ کر چنچل سے بے باک انداز میں میری تعریف کر ڈالی۔

میں دھیرے سے مسکرایا۔ نظریں کمپیوٹر اسکرین سے ہٹ کر ایک لحظے کو اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر آمادگی کے سارے ہی رنگ موجود تھے۔

''کسی شام فراغت مل سکتی ہے آپ کو؟ بالآخر وہ اظہار مدعا پر آ گئی جس کی کہ میں پہلے ہی توقع کر رہا تھا۔'' آپ کی شخصیت اتنی دلچسپ اور پرکشش ہے کہ جی چاہتا ہے ہر وقت آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے باتیں ہی کرتے رہیں۔ مگر یہاں آفس کے ماحول میں آپ جانتے ہی ہیں' ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ کیا کیال ہے' کسی شام کسی ریسٹورینٹ کے پرسکون گوشے میں بیٹھ کر کچھ وقت اکٹھے نہ گزاریں؟ وہاں تفصیل سے' آرام سے بات کریں گے'' ایسی آفرز میرے معمول کا حصہ رہی تھیں۔ ہر لڑکی میری کمپنی کی طلب گار رہتی تھی۔

''میں یونہی اپنی تفریح طبع کا سامان کرنے کے لئے اُس کی طرف متوجہ ہو گیا اور شرارت سے مسکراتے ہوئے اُس کی سمت جھک کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''آپ مجھ سے تنہائی میں کیسی ''گفتگو'' کرنا چاہتی ہیں؟''

''وہی جو سر محفل ممکن نہیں ہے۔'' وہ جواب میں میری نظر سے نظر ملاتے ہوئے بہکے ہوئے شوخ انداز میں بولی۔ اور پھر کھنکھناتی ہوئی ہنسی ہونٹوں میں دباتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر میری فراخ پیشانی پر جے براؤن لہریے دار بالوں کے اسٹائلش گچھے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا' یوں جیسے سنوارنا چاہتی ہو۔

''دھیرج مادام۔ خلوت کی ادائیں جلوت میں دکھا کے کیوں خطرہ پیدا کر رہی ہیں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہہ کر اُس کے بالوں میں اُلجھے ہاتھ پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر ہٹانا چاہا۔

''خطرہ تو پیدا ہو ہی چکا ہے۔'' اُسی لمحے عقب سے ایک سرد آواز سماعت میں گونجی۔ ہم دونوں ہڑبڑا کر پلٹے۔ اور گلاس ڈور دھکیل کر اندر آتی ہستی کو دیکھ کر میری سٹی گم ہو گئی۔ میرا چہرہ یکلخت سفید پڑ گیا۔ مجھے انتصار بھائی کی آمد کا خطرہ تھا مگر یہ وہ نہیں تھے۔ بلکہ وہ ہستی تھی جس کی آمد کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سامنے یوں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے خوف سے میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

♥♥♥

''پلیز! معاف کر دیں ناں، غلطی ہو گئی تھی۔ آئندہ نہیں کروں گا۔ مان جائیں ناں۔''

میں اُسے منا منا کر تھک گیا تھا مگر وہ جیسے کان لپیٹے بیٹھی تھی۔ اُس پر میری التجاؤں اور معافیوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''اچھی بہن نہیں ہیں، دیکھیے میں شرمندہ ہوں۔'' میں نے لجاجت سے اسے دیکھا۔

اُس کے چہرے پر ترشی اور برہمی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں بلا کی ناراضگی نمایاں تھی۔

''بالکل بھی نہیں ہوں۔ ایسے معاملات میں قطعی نہیں ہوں، مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔'' اس نے ہونٹ کھینچ کر کہا۔ اس کے لہجے میں کوئی لچک یا گنجائش نہیں تھی۔

''آپ یقین کیوں نہیں کرتیں کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ خود ہی اُلو کی پٹھی میرے پاس آئی تھی۔'' مجھے دل ہی دل میں شبنم پر تاؤ آ رہا تھا جس کی وجہ سے تنزیلہ اکرام جیسی مہربان اور پیار کرنے والی ہستی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔

جی ہاں۔ وہ تنزیلہ اکرام ہی تھی جس نے کمپیوٹر روم کا وہ ''نظارہ'' ملاحظہ کیا تھا۔ اور پھر بگولے کی طرح واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی تھی۔ میں خجالت کے بے پناہ احساس سے چور ہو کر اس کے پیچھے گیا مگر اُس نے میری کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا بلکہ آفس سے ہی چلی گئی۔ دوسری صبح جیسے ہی اوقات کار شروع ہوئے، میں اس کے ڈیپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا اور اب اپنی صفائیاں پیش کرتے ہوئے معذرت طلب انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

مگر اُس کے چہرے کے خفا خفا منجمد تاثرات پگھل کے نہیں دے رہے تھے۔

''میں اسے لفٹ کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ خود ہی سر پر سوار ہو گئی تھی۔ ماہرہ کی طرح میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔'' میں نے پھر توجیہہ پیش کی۔

''بہت خوب تو ماہرہ سے بھی ایسے ''سین پاٹ'' ہو چکے ہیں؟'' اس نے نگاہ میں طنز بھری حیرت اور غضب سمیٹ کر پھنکارتے ہوئے کہا۔

اس کے قطعی تیور مجھے پریشان کر رہے تھے۔

''وہ دراصل۔ دیکھیے، میں نے تو کسی کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی، لڑکیاں ہی۔ اصل میں۔......'' میں سر کھجا کر کھسیائے ہوئے انداز میں بوکھلا کر کہنے لگا مگر بات بنائے نہیں بن رہی تھی۔

''اب میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ تنزیلہ رحمٰن سے تمہاری محبت کا ڈرامہ محض ڈھونگ ہے۔ تم محبت کی خاطر نہیں، اپنے نفس کی تسکین کی خاطر اس کے قرب کے متلاشی رہتے تھے۔ بھلا ایسے سطحی جذبوں کی آمیزش سے پلنے والے احساسات کو محبت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ نفس ہے جو تمہیں نگر نگر بھٹکا رہا ہے۔ محبت نہیں۔ اگر تمہیں تنزیلہ سے سچی محبت ہوتی تو تم کبھی بھی اِدھر اُدھر منہ ماری نہ کرتے۔ محبت کرنے والوں کی آنکھ اور دل میں زندگی کی ایک ہی مورت اور ایک ہی صورت جلوہ گر رہتی ہے، جبکہ تمہیں نئے نئے منظروں کی جستجو رہتی ہے۔ بھلا وہ بھی کوئی محبت ہے جو اخلاقی حدود و قیود کو پھلانگ جائے؟ محرم نامحرم کا فرق جاتا رہے؟ اس حد تک بے باک اور معیوب ''اظہار محبت'' دراصل نفسانی خواہشات کی تکمیل کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ پاکیزہ محبت کا تعلق روح سے ہوتا ہے اور یہ محبت جسمانی تسکین کی بجائے روحانی سکون سے عبارت ہوتی ہے۔ ایک جائز رشتے کی عدم موجودگی میں مرد زن کا اس حد تک ایک دوسرے کے قریب آ جانا اور غیر اخلاقی اور معیوب حرکات و سکنات کا مرتکب ہونا محبت کے نہیں، ہوس کے زمرے میں آتا ہے۔ افسوس صد افسوس تم کس قدر دیدہ دلیری سے یہ گناہ کرتے آئے ہو۔ اور اس پر شرمندہ بھی نہیں ہو۔ کیا ایک بار بھی تمہارے ضمیر تمہیں نہیں جھنجھوڑا؟ غالباً اس کو بھی محبت کا فریب دے کر مطمئن کرتے رہے ہو۔ تمہارے نزدیک یہ خواہشات اور طلب کے سمندر میں غوطہ لگانے والے سطحی جذبات ''محبت'' جو ٹھہرے۔ کس قدر منفی رویہ ہے تمہارا۔ اخلاق و معاشرت اور قواعد و ضوابط کے ساتھ۔ کمال ہے۔ کس ڈھٹائی سے اپنی بے شری اور مخرب الاخلاق حرکت کو غلطی کا نام دے رہو!''

میں ناگواری محسوس کرنے کے باوجود چپ چاپ اس کا لیکچر سنتا رہا۔ شاید اسی طرح اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ اس کی باتیں مجھے اندر سے جھنجوڑ رہی تھیں۔ کیا واقعی میں نفس کی

ترغیب کا شکار رہا تھا۔؟

میں اپنے تئیں دست ولب سے خطا ہونے والی جذباتی حرکات کو محبت کا حصہ سمجھتا تھا اور اس حد تک کسی سے بے تکلف ہونا میرے نزدیک ایک "بے ضرر" سی ایکٹیویٹی تھی۔

"تمہیں خبر ہے، جب میں تمہارے روم کی طرف آ رہی تھی تو انتصار صاحب گلاس وال سے اندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ چکے تھے؟ تمہیں تو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ تم آفس میں بیٹھے ہوئے ہو۔ اگر کسی اور کی نظر پڑ جاتی تو؟"

اُس نے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے مشتعل ہو کر کہا۔

مجھ پر جیسے سات سمندروں کا پانی گر پڑا۔

"تو گویا انتصار بھائی کے نوٹس میں بھی آ گیا تھا یہ معاملہ؟"

"وہ تو پہلے ہی میرے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ ثبوت اکٹھے کرتے پھر رہے تھے۔ اب مزید بانس پہ جا چڑھیں گے۔"

میں متوحش ہو کر سوچ رہا تھا۔

"میں آپ کو کیوں کر یقین دلاؤں کہ مجھے شبنم سے رتی بھر دلچسپی نہیں ہے۔ آپ مجھے جانتی تو ہیں۔ میں تنزیلہ کی جگہ کسی کو بھی نہیں دے سکتا۔ ایسا ممکن ہوتا تو اب تک یوں خوار نہ پھر رہا ہوتا۔"

میں نے پھر صفائی دی۔

"محض تفریح طبع کے لئے بھی کیوں ایسا گھناؤنا کھیل کھیلا جائے؟"

وہ ابھی تک جلال میں تھی۔ "اور پھر ماہرہ کے ساتھ اس طرح کے رویے کی کیا تک بنتی ہے۔ وہ تمہاری وقتی انجوائے منٹ کو تمہاری رضامندی سمجھ کر تم سے اٹیچ ہو جائے گی، جبکہ تم اس سے شادی نہ کرنے کا عہد کر چکے ہو۔ اُس کی حوصلہ افزائی کر کے کیوں اُسے روگ لگاتے ہو؟ اتنی بے حسی اور خود غرضی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ تم صرف اپنی تسکین کا ذریعہ ڈھونڈتے ہو، دوسروں کے جذبات واحساسات اور نفع نقصان کی تمہیں چنداں پروا نہیں ہوتی۔"

"چلیں، مجھے احساس نہیں ہے تو آپ ہی کر لیں۔ کتنی دیر سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی چاہ رہا ہوں۔ اب تو ناراضگی ختم کر دیں ناں۔"

"بات ناراضگی کی نہیں ہے، اصول واخلاقیات کی ہے۔" وہ کچھ ڈھیلی پڑتے ہوئے بولی۔

"اصول وقواعد کیا ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑیئے، ان پر کون یقین کرتا ہے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر کندھے جھٹکے۔

"قاعدے قانون، نظریات اور اصول وضوابط اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ یہی تو حیاتِ انسان کو حیوانی زندگی سے ممیز کرتے ہیں۔ انہی کو لے کر ہم زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ انہی کے سہارے تو مقصد کائنات کا تعین کرتے ہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔ "سوچو ذرا! اگر زندگی کا کوئی مقصد نہ رہے تو زندگی کتنی بے ترتیب ہو جاتی ہے۔ یہ بے ترتیبی فطری لطف وانبساط سے محرومی کا باعث بن جاتی ہے۔ محرومی بے چینی پیدا کرتی ہے۔ بے چینی انسان کا صبر وقرار اور سکون چھین لیتی ہے۔ اور غور کرو اگر زندگی میں سکون نہ رہے تو کیا وہ زندگی رہتی ہے؟ نہیں کبھی بھی نہیں بلکہ یہ بے سکونی انسان کو بھی سرتاپا ختم کر دیتی ہے۔"

"بجا فرمایا حضور، جو بھی فرمایا۔ مگر کیا اب معافی مل سکتی ہے۔ دیکھئے، آپ کا لیکچر کس درجہ سکون سے سن رہا ہوں، اسی کے انعام میں معاف کر دیں۔"

وہ مسکرا دی۔

"مگر تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ آئندہ اپنے بھٹکتے قدموں اور نظر پر کنٹرول رکھو گے اور نیک انسان بنو گے۔"

"ضرور...... میں نے بلا سوچے سمجھے جھٹ اُس کی بات مان لی۔

یاد رکھو، نیکی عمودی چٹان کی طرح ہوتی ہے جس پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے، اس کے برعکس برائی وہ ڈھلوان ہے جس پر بہ آسانی انسان پھسل سکتا ہے۔ اور یہ اکثر پھسلتا رہتا ہے۔ تمہیں اپنے اندر استقامت اور شفافیت پیدا کرنا ہوگی۔

(Try to be hones with your feelings and deallings)

ٹرائی ٹو بی آنسٹ وِد یور فیلنگز اینڈ ڈیلنگز۔ جب تک اپنی ذات سے سچے نہیں رہو گے کہیں بھی سچائی کا یقین نہیں پا سکو گے کہ یہی سچ ہے۔ اگر سچ کی مشعل ضرورت کے وقت روشن نہ کی جائے تو اس کا وجود بے فائدہ ہو جاتا ہے کہ چراغ جلانے کا اصل وقت غروب آفتاب کے بعد ہوتا ہے نہ کہ دن کی روشنی میں"

''آپ اس قدر خشک اور لمبے لمبے ڈائیلاگ کیسے بول لیتی ہیں۔'' اس کا خفا موڈ بحال ہوتے ہی مجھے ہری ہری سوجھنے لگی تھی۔

''ایک تو تمہارے سامنے عقل کی بات کہنا گویا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر عاجز آئے ہوئے انداز میں بولی۔

''میں پھر ایک بار زور دے کر کہہ رہی ہوں کہ اپنے جذبوں میں خلوص پیدا کرو۔ جس طرح سخت محنت کا نام کامیابی ہے' اسی طرح پُرخلوص محبت کا نام انسانیت ہے۔ مہاتما بدھ کا بڑا خوبصورت سا قول ہے کہ ''ناراض کو محبت' بُرے کو نیکی اور جھوٹے کو صداقت سے رام کرو۔''

''مان گئے صاحب' آپ کا دماغ سچ مچ عمدہ خیالات کا سمندر ہے۔'' میری نگاہ میں ستائش کی چمک تھی اور اُس کی خوبیوں کا اعتراف بھی۔

''بھلا کیا راز ہے ایسی متوازن' متحمل اور مدبر شخصیت کا۔ کتنی سیری اور سکون ہے آپ کی نگاہ مے'' میں سچ مچ معترف تھا۔

''اس کا بہت آسان سا نسخہ ہے۔ جو میرے پاس موجود ہے' اس پر ناز نہیں اور جو نہیں ہے' اس کی طمع نہیں رکھتی۔ بس یہی ہے' میرے سکون اور تحمل مزاجی کی وجہ۔''

''آپ کو سر انتصار اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا' چوکیدار نبی بخش نے آ کر اطلاع پہنچائی۔

''انہیں کہنا' میں پانچ منٹ بعد آ رہا ہوں۔''

نبی بخش کو جوابی پیغام دے کر میں دوبارہ تنزیلہ کی طرف متوجہ ہوا تو میری آنکھوں میں اُلجھن اور کشمکش کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بات اُن کی انا پر ضرب کی طرح لگے گی' جاؤ جا کر بات سن لو۔'' وہ یکدم کچھ متوحش سی ہو کر بولی۔

''وہ کوئی ان داتا تو نہیں ہیں' چلا جاؤں گا۔'' میں نے چڑ کر جواب دیا۔

''تم کبھی مصلحت سے کام نہ لینا' اچھا؟'' اس نے خفگی سے دیکھا۔

''مصلحت کیا ہوتی ہے مصلحت۔ بزدلی کا دوسرا نام اور بس۔ میں بزدل بننا پسند نہیں کرتا۔'' میں نے نخوت سے کہا۔

''مصلحت کا ایک اور مطلب بھی نکلتا ہے' وہ ہے محتاط روی۔ ہر چیز کے منفی پہلو اور معانی نہ ڈھونڈا کرو۔'' اس نے تنبیہ کی۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری بے پرواہ ادا پر وہ قدرے تپ کر مجھے گھورنے لگی۔

''لگتا ہے' تمہیں کسی کی پروا نہیں ہے۔ والدین کی بھی نہیں ہے۔ وہ جو اولاد کی اتنی شفقت اور مشقت کے ساتھ پالتے ہیں۔ جوں جوں اولاد جوان ہوتی جاتی ہے' ان کی امیدیں بھی ساتھ ساتھ جوان ہوتی جاتی ہیں۔ وہ اپنے بچے کو خوش اور شاد آباد دیکھنا چاہتے ہیں اور......''

''مگر میرے ماں باپ کا یہ منشا نہیں ہے' وہ دوسروں سے مختلف ہیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''والدین کی کوئی قسم نہیں ہوتی' سب ایک جیسے جذبات کے مالک ہوتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے' میں سن ہی لوں ''صاحب'' کی بات۔'' میں موضوع کے کترانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا سنیں' ایک کام تو کریں۔'' میں چلتے چلتے ایک دم دوبارہ پلٹ آیا۔ اب کے میرے تاثرات میں سنجیدگی اور سوچ کے عکس تھے۔

''آپ میرے لئے کوئی جاب تلاش کر سکتی ہیں؟''

''وہ کاہے کے لیے؟'' اس نے بغور میرا چہرہ ٹٹولا۔

''مجھے لگتا ہے' میرا یہاں سے دانہ پانی اُٹھنے والا ہے۔ انتصار بھائی اب کوئی بہانہ تلاش کر رہے ہیں' میری یہاں سے چھٹی کرانے کے لئے۔''

وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

''سنو تحریم! ایک بات مانو گے۔ تم واپس لاہور چلے جاؤ' اپنے والدین کے پاس۔''

وہ چونک کر مجھ پر نگاہ ٹکا کر بولی۔

میں جھنجھلا کر بھنائے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

''پھر وہی ٹاپک' آپ جانتی ہیں' میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ہار ماننا میری انا کی توہین کے مترادف ہے۔ میں اب اسی وقت ان کے سامنے جاؤں گا' جب بہت بڑا اور مشہور آدمی بن چکا ہوں گا۔'' میں نے مصمم لہجے میں کہا۔

''بڑا.....کتنا بڑا آدمی؟'' وہ ٹھوڑی پہ ہاتھ ٹکا کر نپے تلے انداز میں دیکھنے لگی۔

''اثر و رسوخ والا' نام والا' پیسے والا' آن بان اور شان والا۔'' میں دبدبے سے کہا۔

''نہایت بچکانہ سوچ ہے۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''اگر میری صاف گوئی تمہیں بُری نہ لگے تو میں کہوں گی کہ تم کس برتے پہ اعلیٰ مقام تک پہنچنا چاہتے ہو۔ تعلیمی اعتبار سے تمہارے پاس سرف انٹر کی سند ہے۔ انجینئرنگ کی تعلیم تو تم نے دوسرے سال کے بعد ادھوری چھوڑ دی تھی۔ کسی اچھی جاب کا تجربہ یا ہنر تمہارے پاس نہیں ہے۔ محض انٹر کی سند اور سادہ سے کمپیوٹر کورس کے بل بوتے پر تم کیا جاب حاصل کر سکتے ہو۔ زیادہ سے زیادہ ریسپشنٹ کی یا ٹیلی فون آپریٹر کی جاب مل جائے گی۔ اب تو کلرک بھرتی ہونے کے لئے بھی تعلیمی قابلیت کم از کم بی اے درکار ہوتی ہے۔ ایک ریسپشنٹ یا ٹیلی فون آپریٹر بن کر پندرہ سو یا زیادہ زیادہ دو ہزار ماہوار تنخواہ پاؤ گے۔ اس سے کیسے گزارہ ہوگا۔ رہائش کا' کھانے پینے کا' آنے جانے کا خرچ اور دیگر ذاتی ضروریات' یہ سب کہاں سے پورا کرو گے۔ گھر والوں سے پیسے لینے تم نے خود پر حرام کر لئے ہیں۔ یہاں تمہارے تایا کے گھر والے تمہارے خلاف ہو چکے ہیں۔ نوکری تمہاری ایک دو دن کی مہمان ہے۔ پھر کس واسطے یہاں خجل خوار ہوتے ہو۔ واپسی کا در تمہارے لئے بند تو نہیں ہوا۔ تم نے خود ہی اپنی جذباتیت کے سبب ہر سبیل بند کر دی ہے۔''

''کچھ عرصے تک اسلام آباد میں رہنا میری مجبوری ہے۔ میں ناصر حیات صاحب کا ٹی وی پلے کر رہا ہوں۔ اس کی ریہرسل اور ریکارڈنگ کے لئے مجھے اسلام آباد قیام کرنا ہی ہوگا اور اس عرصے تک میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی نوکری مل جائے۔ آپ دیکھیے گا' ایک بار ٹی وی پہ میرا پلے چل گیا تو پھر راتوں رات مقدر کا ستارہ چمک اُٹھے گا۔ ہر جگہ میری شہرت پھیل جائے گی اور تنزیلہ کا باپ وہ موٹا سیٹھ سر کے بل میرے پاس دوڑا چلا آئے گا' خود رشتہ پیش کرے گا اپنی بیٹی کا۔''

میں نے دانت پیستے ہوئے تصور ہی تصور میں سیٹھ رحمٰن کو دھتکارا تو تنزیلہ نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یا خدا! اتنی سطحی سوچ کیوں ہے تمہاری۔'' وہ زچ سی ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''کسی کی نظر میں یا دل میں اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ اوصاف کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ محض ظاہری آن بان اور مادّی کامیابیاں حاصل کر کے انسان کامیاب یا عظیم

نہیں بنا جاتا۔ کوّا بلند ترین مینار پر بیٹھنے سے عقاب نہیں بن جائے گا۔ وہی رہے گا ڈرپوک' خود غرض اور لالچی۔ عقاب جیسی بلند ہمتی' بہادری اور عزم و استقامت نہیں آئے گی اس میں۔''

''مجھے کوا کہہ رہی ہیں آپ؟'' میں اس کی بات کی گہرائی تک پہنچنے کی زحمت کئے بغیر محض ایک لفظ پکڑ کر خفا ہونے لگا۔

''میں مستند قسم کی خوبصورتی کا مالک ہوں جناب' کون سی ایسی لڑکی ہو گی جو مجھ سے مل متاثر نہ ہوتی ہو۔'' میں نے کالر اکڑا کر فخریہ کہا۔

''چہ چہ۔ کتنے خود پرست ہو تم۔'' وہ افسوس سے سر ہلانے لگی۔ ''ساری زندگی دیوتا بن کر گزارنا چاہتے ہو۔ نیچے اُترنا تمہارے منصب کے خلاف ہے گویا۔ او بھائی میرے اپنی نظر میں گہرائی پیدا کرو۔ صرف وہ کچھ نہ دیکھو جو تمہاری حسب منشا ہے بلکہ نظر کو وہ کچھ دیکھنے کا عادی بھی بناؤ جو تم نہیں دیکھنا چاہیت مگر وہ بہر حال تلخ حقائق کی طرح موجود محسوس ہوتے ہیں۔''

''آپ تھکتی نہیں ہیں تقریر کر کے۔'' میں اس کی باتوں کا اثر لئے بغیر محض اس کا دھیان ہٹانے کو چھیڑ خانی کرنے لگا۔

''تمہیں پھر اٹکھیلیاں سوجھ رہی ہیں' جبکہ میں سنجیدہ ہوں۔ ایسا کرو' تم اپنے والدین سے صلح کر لو۔ اور واپس لاہور چلے جاؤ۔ اپنا انجینئرنگ کا کورس مکمل کرو۔ تعلیم مکمل کر کے انشاء اللہ تمہیں بہت اچھی جاب مل جائے گی۔''

وہ پھر مجھے اپنے من پسند پٹیاں پڑھا رہی تھی۔

''صلح ممکن نہیں ہے مائی ڈیئر' والدین کے پاس واپس جانے کا مطلب یہ ہے کہ میں ماہرہ سے شادی کر لوں اور تنزیلہ کو بھول جاؤں۔ میں ایسا کر سکتا ہوں؟ کسی قیمت پر نہیں کر سکتا۔ آپ جانتی تو ہیں۔ میرے دل کا حال پھر بھی اتنے دل جلے مشورے دیت ہیں۔ بس آپ کسی جاب کا انتظام کر دیجیے اگر ممکن ہو تو۔'' میں اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

''میں کوشش کروں گی۔'' اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا۔ ''مگر یہ بات مجھے مسلسل کھٹک رہی ہے کہ اتنی کم تنخواہ والی جاب میں تم گزارہ کیسے کرو گے' جبکہ تمہیں کوئی بیک سپورٹ بھی نہیں ہے۔ تم دراصل ہو بھی جذباتی ورنہ ٹھنڈے دل و دماغ سے پوری ذمّے داری سے یہاں اپنا کام نپٹانے لگو تو کیوں! انتصار صاحب تمہارے درپے ہوں۔''

''دفتری غلطیاں تو بہانہ ہیں۔ وہ ذاتی انتقام کی خاطر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھ لیجئے گا' کسی دن معمولی سی بات پر جواب دے دیں گے۔''

''دراصل ایڈمن کا شعبہ ہے میرے دائرہ کار سے بالکل باہر ہے۔ انتصار صاحب کے علاوہ کوئی اور دخل اندازی بھی نہیں کرسکتا وگرنہ تم یہیں جاب کرتے رہتے۔ میں چاہوں تو انتصار صاحب سے تمہاری سفارش کردوں مگر اس کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ آیا وہ میری درخواست قبول کرلیں گے یا نہیں۔ اور دوسری بڑی وجہ میری ریپوٹیشن ہے۔ تم ان کی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہو' اور پھر خدا کے فضل و کرم سے تمہاری شکل و صورت ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ اُن کے غلیظ ذہن میں فٹ سے ''اسٹوری'' کا پلاٹ آجائے گا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ ہمارے درمیان کوئی چکر ہے۔ ایسے لوگ تو لگے سگے رشتوں کو کچھ نہیں سمجھتے' ہم تو پھر ''احساساتی'' بہن بھائی ہیں۔ ایک ماں کے پیٹ سے تو پیدا نہیں ہوئے۔ یہ تو ہمارے اپنے جذبات و احساسات ہیں' کوئی دوسرا ان کی سچائی ناپنے کی زحمت کہاں کرے گا۔'' اس کے چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی۔

یکایک میرے شریانوں میں خون جوش مارنے لگا۔ چہرہ سرخ پڑنے لگا مٹھیاں بھنچ گئیں اور تنفس کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔

''آپ کو سفارش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود دیکھ لوں گا اس سورے کو۔ اونہہ بڑا بنا پھرتا ہے۔ کوئی اَن داتا تو نہیں ہے۔ لعنت بھیجتا ہوں میں اُس کی نوکری پہ۔ دشمنی پہ اترے گا تو میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ ناکوں چنے چبوا دوں گا۔ اس کی غیرت اور شرم کی تو ایسی کی تیسی۔ اس کی بہن میرے ایک اشارے پر اپنا آپ پیش کردے گی۔ پھر میں اُسے بتاؤں گا کہ غیرت کا جنازہ کیسے نکالا جاتا ہے۔ اُس کی بہن کے ساتھ میں جو سلوک کروں گا' وہ بذات خود اس کے لئے مکافات عمل بن جائے گا۔''

میں اتنا کہہ کر رکا نہیں' پھنکارتا' غراتا ہوا بگولے کی طرح کنارے سے نکل گیا۔ وہ بے چاری پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئی۔ یقیناً میرے تیوروں سے ہراساں ہوگئی تھی۔

♥♥♥

اور پھر وہی ہوا چند دن بعد کہ ایک معمولی ڈکٹیشن کی غلطی کو بنیاد بنا کر انتصار بھائی نے مجھے نوکری سے برخاست کردیا۔

''تم جیسے لوگ نوکریاں نہیں کرسکتے' بس لڑکی بغل میں ہو' کرنے کو کوئی کام نہ ہو' عیش و آرام ملے' مفت کی تنخواہ ملتی رہے۔ اس میں خوش رہتے ہیں۔ یہ تو میری مہربانی تھی و تمہیں یہاں لگوا دیا وگرنہ تم جیسوں کو کون نوکری دیتا ہے۔ حقیقت ہی کیا ہے تمہاری۔ میرے بل پر عیش کررہے تھے اور میری ہی پیٹھ میں چھرا گھونپنے لگے۔'' وہ دانت پیستے ہوئے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میرے گویا سر سے لگی اور تلوؤں میں بجھی۔ غصے اور جوش سے میرا چہرہ اور آنکھیں لہو رنگ ہوگئیں۔

''کیا سمجھتے ہیں آپ خود کو' بڑے پھنے خان بنے پھرتے ہیں۔ میں چاہوں تو آپ کو لمحوں میں آپ کی اوقات یاد دلا دوں۔ ہیں تو وہی ناں۔ زمانے بھر کے عیاش اور بدکردار۔ آگ تو آپ کو اس لیے لگی ہے کہ میرے اباجی اور امی نے آپ کے متوقع سسرالیوں کو حقیقت حال کیوں بتادی اور یہ کہ آپ کے باہر سے بیوی لانے کے فیصلے پر خاندان والوں کو ساتھ ملا کر بائیکاٹ کرنے کا پلان کیوں بنایا جارہا ہے اور یہ بات بھی آپ کو اتنے دنوں سے کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی کہ آپ کی ماتحت خواتین آپکے مقابلے میں مجھ پر کیوں والہ و شید ہوتی جارہی ہیں۔ مجھے آپ کی فطرت کا پہلے ہی اندازہ تھا۔ سنبھال کے رکھیے اپنی عنایات کو۔ میں تھوکتا بھی نہیں ہوں۔''

میرے بدلحاظ انداز پر وہ آپے سے باہر ہونے لگے۔ پارہ چڑھ کر آخری ڈگری تک جا پہنچا۔

"بکواس بند کرو کسی.....کی اولاد۔" اُنہوں نے گالی دے کہا۔ "میں چاہوں تو تمہیں اسی جگہ پہ ختم کرادوں اور تمہارا پتہ بھی نہ چلے۔ بچو! تم نے ابھی میری مہربانیاں ہی دیکھی ہیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی نظر آئے تو ایف آئی اے کو تمہارے پیچھے لگوادوں گا۔ تم میری پہنچ سے واقف نہیں ہو" وہ درندوں کی طرح غرائے تھے۔

غرض یہ کہ انتہائی معرکہ ہوا۔ تلخ کلامی سے بات گالم گلوچ تک جا پہنچی۔ شاید ہاتھا پائی بھی ہو جاتی مگر اس وقت آفس میں یہ کاروائی کی جارہی تھی۔ میں تو بے قابو ہو چکا تھا مگر انتصار بھائی نے اپنی ریپوٹیشن کا لحاظ کر کے مزید پیش قدمی موقوف کر دی۔

میں نے استعفا اُس کے منہ پر مارا اور حق نواز شاہ کے پاس چلا آیا۔ وہ دوائیوں کی کسی کمپنی میں ملازم تھا اور صبح کا نکلا شام چھ بجے تک واپس لوٹتا تھا۔ بڑا ہی دار اور محبت کرنے والا بندہ تھا۔ یاروں کا یار تھا۔ اس نے کھلے دل سے مجھے خوش آمدید کہا اور دوسری صبح جاتے ہوئے گھر کی چابیاں ہاتھ میں تھما گیا۔

"چاہے تو گھر پر آرام کر لینا اور جو باہر جانے کا موڈ بن جائے تو تالا لگا کے چلے جانا۔"

میں سارا دن فلیٹ پر پڑا اپنے لائحہ عمل کے بارے میں سوچتا رہا۔

ایک روز کی سوچ بچار کے بعد اگلے روز میں تنزیلہ اکرام کے ڈیپارٹمنٹ میں اُس کے روبرو تھا۔ اسے بھی افسوس تھا نوکری جانے کا۔ مگر خیر یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔

"تمہارے نام ایک خط آیا رکھا ہے۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔" اُس نے دراز سے لفافہ نکال کر میری سمت بڑھایا جسے دیکھتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔

یہ تنزیلہ رحمٰن کا خط تھا۔ اس سے خط و کتابت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے وسوسوں اور اندیشوں کے ہمراہ لفافہ چاک کیا۔

حسب معمول جذبوں کا بے ساختہ اظہار تھا' اپنے بے چین دل کی کیفیات رقم تھیں مگر میرے اعصاب سے تو ایک جملہ جیسے چمٹ کر رہ گیا۔

"مدتوں سے نہیں دیکھا۔ آنکھیں ترس گئی ہیں یار من' کب تک صبر آزماؤ گے۔ ایسا نہ ہو جب تمہیں فرصت ملے تو مجھے قضا موقع نہ دے۔ یوں لگنے لگا ہے جیسے مجھے موت بہ آسانی آجائے گی مگر تم نہیں آسکو گے۔"

تمہاری تنزیلہ"

میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

محبت ابر کی صورت۔
کبھی بے چین رہنا ہے۔
کبھی آرام کرنا ہے۔
ادھورا کام کرنا ہے۔

میرے دل کی شاخ پر اُس کی یاد کے شگوفے کھلنے لگے۔ اس کی کھوئی ہوئی یاد دوبارہ درد دل پر دستکیں دینے لگی تھی۔

"کیا جواب دوں اس کا۔ میں نے چپ چاپ خط تنزیلہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس سے اب کیا چھپارہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک انہماک سے خط پڑھتی رہی پھر ہولے سے مسکرادی۔ یوں جیسے منہ بند کلی نے دھیرے سے آنکھ کھول کے گلشن ہستی پہ نگاہ کی ہو۔

"میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو جواب میں اسے یہ نظم ارسال کر دیتی۔

ابھی کچھ دیر باقی ہے دعاؤں کی رسائی میں
ابھی تو رنگ نہیں آئے ہتھیلی کی حنائی میں
ابھی تاثیر سے خالی تری چوڑی کھنکتی ہے
تجھے کندن بنادے جب شب ہجراں جدائی میں
تو پرہ ہے سوچتا اک دن تمہارے پاس آؤں گا
تو یہ بھی سوچنا در واپسی کا بند کرنا ہے۔"

"تنزیلہ یہ بات سچ ہے ناں کہ آپ کا شمار بھی ہمارے "قبیلے" میں ہوتا ہے چوٹ کھائی ہے ناں دل پہ۔ دیکھیے جھوٹ نہ بولیے۔ آپ کی آنکھیں اقرار کر رہی ہیں۔ بذات خود گواہ ہیں۔"

میں سیدھا اُس کی شفاف اور متین آنکھوں میں دیکھتا ہوا دھیرے سے جھک کو پوچھ رہا تھا۔

اس نے بے اختیار نظر چرالی' شاید اس ڈر سے کہ میں اس کی آنکھوں میں حقیقت نہ کھوج لوں۔

"اِن باتوں کو چھوڑو۔" اس نے واضح طور پر موضوع بدلا تھا۔

"تم ایسا کرو لاہور کا چکر لگا آؤ۔ تنزیلہ سے مل لو ہو سکتا ہے کوئی قابلِ عمل اور قابلِ قبول حل سامنے آ جائے۔ پھر واپسی پر تمہاری جاب کا بندوبست کرتے ہیں۔ میں نے ایک دو لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ انشاءاللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"آپ بات بدل رہی ہیں۔ بہرحال۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے یقین ہے کسی روز آپ کی پراسرار شخصیت کا بھید کھل جائے گا۔"

"کہاں سے بن گئی میں پراسرار۔ سیدھی سادھی سی لڑکی ہوں بلکہ خاتون۔" وہ مسکرائی۔

"یہ سیدھے سادھے لوگ ہوتے ہیں بہت ہوشیار۔" میں یونہی گنگنایا۔ "جب کرتے ہیں دل پہ وار تو ہو جاتا ہے بیڑا پار۔ یہ سیدھے سادھے لوگ......"

"اوہو۔ کیا بینڈ باجہ بجانا شروع ہو گئے ہو۔"

وہ خفت زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں اس کی شرمیلی گھبراہٹ کی ادا سے لطف لینے لگا۔

"سنو کم از کم اپنی امی سے ضرور مل کے آنا۔" میں دروازے پر تھا جب اُس نے پیچھے سے پکار کر نرمی سے تاکید کی۔

میں ہونٹ بھینچ کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ خود پر قابو پانے میں بہت جدوجہد کا سامنا تھا مجھے۔

"جیسے ہی واپس اسلام آباد آؤ فوراً مجھے اپنی آمد کی اطلاع دینا ورنہ میں پریشان رہوں گی۔ اور ہاں ماہرہ کے بارے میں ایسی ویسی سوچوں کا یہیں خاتمہ کرتے جاؤ۔ کیا بک رہے تھے اُس دن۔" وہ غصے سے دیکھ رہی تھی۔

میری کنپٹیوں کے پاس شعلے سے دہکنے لگے۔

"وہ تو میرا "ہتھیار" ہے جو اُس کے بھائی کے خلاف جنگ میں کام آئے گا۔" میں نے سفاکی سے کہا۔

"بکواس نہیں کرو" اس نے بے لحاظ جھڑک دیا۔

"جنگ میں کسی کی غیرت اور آبرو سے کھیلنا بزدلی ہوتی ہے۔ تمہیں تو بزدل بننا سخت ناگوار گزرتا ہے۔ پھر؟ سنو تحریم! جو شخص انتقام لینے کے طریقوں پر غور کرتا رہتا ہے اس کے زخم ہمیشہ

تازہ رہتے ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ جارحانہ انداز میں کھیلنے مخالفت کا کم اور اپنا بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ تم معاف کر دو بھلا دو۔ اور سچ پوچھو تو معاف کر دینا سب سے بڑا انتقام ہوا کرتا ہے۔ مذہب اور اعلیٰ اقدار و روایات کے حامی لوگ کسی سے انتقام لینے یا بدلہ اُتارنے کے لئے اُسے فراخدلی سے معاف کر دیا کرتے ہیں اور دشمن معافی کے اس دائرے میں قید ہو کر تا زندگی پچھتاوے کا شکار رہتا ہے۔"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ میں اُسے معاف کرتا ہوں یا......"

میں نے سلگتے ہوئے انداز میں کہہ کر جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا پھر خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔

جس وقت میں عمارت کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے آیا تھا عین اسی لمحے انتصار بھائی اپنی گاڑی پہ کہیں جانے کے لیے سوار ہوئے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ہی اچانک اُن کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں زمانے بھر کا زہر اور خونی تاثر جھلکنے لگا تھا۔ میں پروا کیے بغیر گردن اکڑا کے اپنی راہ ہو لیا۔

"اونہہ۔ میں کیا ڈرتا ہوں تمہاری دھمکیوں سے؟ میری تو جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔" میں نے سڑک پر پڑے پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے تنفر سے سوچا اور پھر سامنے سے آتی ہوئی میٹرو کو اشارہ دے کر روک کر اس میں بیٹھ گیا۔

کچھ چیزیں صرف محسوس کی جاتی ہیں' ان کا لمس اور وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً خوشی' غمی' محبت' نفرت' جذبے صرف محسوساتی تاثیر رکھتے ہیں۔ یہ محسوسات کی دنیا میں ہلچل مچاتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر غم کا احساس۔

غم اشتہار نہیں ہوتے جو سڑک پر یا چوک پر ٹنگے نظر آ جائیں۔ یہ تو محسوس کیے جاتے ہیں۔ کبھی اونچے اونچے بلند و بانگ کھوکھلے قہقہوں کے اندر' کبھی حزینہ مسکراہٹ کی تہہ میں اور کبھی مصنوعی بشاشت کے پس پردہ۔

تنزیلہ رحمٰن کا پورا سراپا اس کی نا آسودگی اور افسردگی کا اعلان کر رہا تھا۔ اک اک نقش گواہ تھا کہ تم بن جتنے دن بیتے' وہ زمین پر نہیں انگاروں پر بسر ہوئے تھے۔

میرے وجود میں ٹوٹتی چیختی تنہائیاں اور اداسیاں بھی اپنے دل کا حال زبان سے بیان کر رہی تھیں۔ دونوں اطراف سے مایوس اور مردہ دلی کا خاموش اظہار ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ کہ زبان سے کچھ کہنے کو باقی بچا ہی کیا تھا۔

"تم کمزور نظر آ رہے ہو۔" وہ میرا ابجھا بجھا' بے ترتیب سراپا سر سے پاؤں تک جانچ کر آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں کمزور اس وقت پڑتا ہوں' جب تمہارے خطوط کے جملوں سے چھلکتے جذبے مجھے پاگل بنانے لگتے ہیں" ایک گہرا سانس پارک کی فضا کے سپرد کرتے ہوئے میں تھکے تھکے انداز میں درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"تم سناؤ۔ تم کیسی رہیں؟" میری نظروں نے اس کا وجود گرفت میں لے لیا۔ وہی دلکشی' ہی جاذبیت' اور حسن شباب۔ مگر چہرے پہ صدیوں کی تھکن اور غمگینی رقصاں تھی۔

"تمہارے بغیر بہت بے چین اور اُداس رہی ہوں۔" وہ نظر سے مجھ پہ پیار نچھاور کرتے ہوئے ادائے محبوبیت سے بولی۔

اس کی میٹھی میٹھی جادو بھری ادائیں اور قربتوں کا احساس دلائے مخمور انداز آج بھی جوں کے توں سلامت تھے۔ مگر میں شعوری طور پر محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر تنزیلہ اکرام کی پند و نصائح ذہن کے اسکرین پر پرنٹ ہو گئی تھیں۔ محرم اور نامحرم کے درمیان فاصلہ اور غیر اخلاقی حرکات و سکنات سے پرہیز کے سلسلے میں اُس کا لمبا چوڑا ناراضگی بھرا لیکچر مجھے انجانے میں از بر یاد ہو گیا تھا۔

"سنو تنزیلہ' اسٹار کو کمپنی میں بھی ایک تنزیلہ ہوتی ہے۔" اُس کی یاد آتے ہی بے ساختہ میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں اسے تنزیلہ اکرام کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

اس وقت مجھے اس کے بہت سے انداز یاد آ رہے تھے۔ آنکھوں کی متین و شگفتہ شفاف چمک۔

بظاہر مستحکم انداز میں بلا کا حجاب۔

شگفتگی اور شائستگی کی آمیزش لئے اس کی مدھم مسکراہٹ۔

بتانے' سمجھانے کے رواں برجستہ انداز۔

ڈانٹنے والا اپنائیت بھرا لہجہ۔

اور مسکراتا ہوا کھلا کھلا سراپا۔

"مجھے تین روز ہو گئے ہیں' لاہور آئے ہوئے' میرا خیال ہے مجھے کل واپس چلے جانا چاہیے۔ تنزیلہ سے جاب کا کہہ رکھا تھا ہو سکتا ہے' اس بارے میں معاملہ کچھ آگے بڑھا ہو۔" اس کی یاد کے ساتھ ہی مجھے اسلام آباد کے بکھیڑے الجھانے لگے۔

"اتنی جلدی چلے جاؤ گے؟" وہ بے اختیار ہو کر کہ بیٹھی اور تشنہ تشنہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر شام کے بڑھتے ہوئے سایوں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔

"جانا تو ہے میں لاہور تو صرف تم سے ملنے آیا تھا' تمہاری خواہش پر۔ اپنے گھر والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ان دن سے اپنے یونیورسٹی کے ایک دوست کے ہاں قیام ہے۔ گھر تو جا نہیں سکتا۔ اب اتنے دن اُس کے ہاں رہنا مناسب نہیں لگے گا اور پھر مزید یہاں رہنے سے مسائل کا

حل ممکن بھی نہیں ہے۔ تم بتا رہی ہو کہ تمہارے پاپا ہر ممکن طریقے سے صلح کے خواہاں ہیں۔ وہ کبھی بھی خلع کے لئے درخواست نہیں دیں گے۔ ایسی صورت میں کیا کیا جا سکتا ہے!'' میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

یکا یک میرا خوش گمان دل تلخی کے دھوئیں سے بھرنے لگا۔

ہر طرف مایوسی' ہر گام ناکامی' ہر لحظہ افسردگی۔

رخصت کے سمے عجب بے یقینی سی طاری تھی۔ دلوں میں' جذبات میں' محسوسات میں حتیٰ کہ قدموں میں بھی۔

کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے۔ کیا کیا رنگ نہ بھرے تھے' تخیل کی تصویروں میں۔

سب یاد تھا۔ سب ہی کچھ۔

آ کسی شام کسی یاد کی دہلیز پہ آ۔

عمر گزری ہے تجھے دیکھے ہوئے' بہلا ہوئے۔

یاد ہے؟ ہم تجھے دل مانتے تھے۔

اپنے سینے میں مچلتا ہوا ضدی بچہ۔

تیرے ہر ناز کو انگلی سے پکڑ کر اکثر۔

نت نئے خواب کے بازار میں لے آتا تھا۔

تیرے ہر نخرے کی فرمائش پر۔

ایک جیون کہ تمناؤں کی بینائی سے ہم دیکھتے تھکتے ہی نہ تھے۔ سوچتے تھے۔

ایک چھوٹا سا گھر۔

محبت کی فضا' ہم دونوں۔

اور کسی بات پہ تکیوں سے لڑائیاں بھی۔

پھر کسی ہنستے ہوئے رو پڑنا۔ اور پر روتے ہوئے ہنس پڑنا۔

اور تھک ہار کے گر پڑنے کا معصوم خوش بخش خیال۔

یاد ہے؟ ہم تجھے سکھ مانتے تھے۔

رات ہنس پڑتی تھی بے ساختہ درشن سے ترے

دن تری دوری سے رو پڑتا تھا۔

یاد ہے؟ ہم تجھے جاں کہتے تھے۔

تیری خاموشی سے مر جاتے تھے' تیری آواز سے جی اُٹھتے تھے۔

تجھ کو چھو لینے سے اک زندگی آ جاتی تھی شریانوں میں۔

تھام لینے سے کوئی شہر سا بس جاتا تھا ویرانوں میں۔

یاد ہے؟ ہم تجھے ملنے کے لئے۔

وقت سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔

اور ملاقات کے بعد۔

ہم بہت دیر سے گھر آتے تو کہتے کہ ہمیں کچھ نہ کہو۔

ہم بہت دور سے گھر آئے ہیں۔

اس قدر دور سے آئے ہیں کہ شاید ہی کوئی آ پائے۔

یاد ہے؟ ہم تجھے بھگوان سمجھتے تھے مگر کفر سے ڈر جاتے تھے۔

تیرے چھن جانے کا ڈر ٹھیک سے رکھتا تھا مسلمان ہمیں۔

آ کسی شام کسی یاد کی دہلیز پہ آ۔

تیرے بھولے ہوئے رستوں پہ لیے پھرتا ہے ایمان ہمیں۔ اور کہتا ہے کہ پہچان''

یاد ہے؟ ہم تجھے ایمان کہا کرتے تھے۔

♥♥♥

''بہت ساری حقیقتیں جن سے ہم جان بوجھ کر نظر چرائے رہتے ہیں' اُن سے انکاری ہونا ہمارے لئے شدید مسائل کا باعث بن جاتا ہے۔ ان حقائق کو خوشدلی اور ذہن ودل کی بھرپور آمادگی کے ساتھ تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ دیکھو قدرت کی تقسیم کا اپنا ایک طریقہ کار ہے' کوئی بادشاہ بننے کے لئے اس دنیا میں آتا ہے' کسی کو فقیرانہ چولا نصیب ہوتا ہے۔ کوئی سخاوت کے دریا بہا دیتا ہے اور کہیں کوئی دردر کی بھیک مانگتا ذلیل وخوار ہوتا پھرتا ہے۔ یہ فطرت کی نیرنگیاں ہیں' مشیت ایزدی ہے۔ خدا تعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طبقے میں رکھ سکتا تھا مگر نہیں۔ اس نے ہر ایک کو مختلف منصب سونپا۔ ایک دوسرے سے جداگانہ صورتیں دیں' عقل وفہم دی۔ دنیا کا کوئی ایسا بدن نہیں جو ہر لحاظ سے دوسرے کی کاپی ہو' ہر ایک کو اپنی فطر پر پیدا کیا گیا۔ کسی کو حسن سیرت سے سنورا اور کسی کو حسن صورت عطا کی' کسی کو دونوں خوبیوں سے مرصع کر دیا اور کہیں کسی ایک خوبی کی کمی بیشی کر دی۔ کسی کو ایک وصف سے آراستہ کر دیا اور کسی کو دوسرے سے۔ لیکن ہم لوگ ان فطری حقائق کو آسانی سے تسلیم کر لینا گویا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے دکھ بھی اٹھاتے ہیں۔

''خدا نے تمہیں بہترین شکل وصورت سے نوازا' تمہیں آسودہ حال گھرانے میں پیدا کیا' محبت کا ہنر بخشا۔ مگر تم نے خدائی انعام کو اوور اسٹیمیٹ کیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ مجھ میں دنیا فتح کرنے کی جملہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ دنیا تمہارے قدموں میں ہے مگر اب دیکھ لو زندگی خود تمہیں بتلا رہی ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ تم پہلے پہل یہ حقیقت تسلیم نہیں کر رہے تھے کہ انسان ہر میدان میں اور ہر مقابلے میں نمبرون پوزیشن حاصل نہیں کر سکتا مگر اب تمہیں بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔

''سو حقیقتوں کو قبول کر لینا ہی دانش مندی ہوا کرتی ہے۔ بہت سی خوبیاں جو ہم دوسروں میں دیکھتے ہیں' وہ خود میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں مگر وہ ہم میں موجود نہیں ہوتیں یا دوسرے لفظوں میں ہم ان کے اہل نہیں ہوتے۔ دنیا میں موجود ہر شے پر ہر بندے کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے میں نہایت حقیقت پسندی کا مظاہر کرتے ہوئے اس واشگاف سچائی کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم میں وہ صلاحیت میں وہ صلاحیت نہیں پیدا کی گئی جو دوسرے کو ودیعت کی گئی ہے۔ پھر مقابلہ کیسا' دنیا میں بہت سے لوگ ہم سے اچھے ہوتے ہیں' ہم اُن جیسے نہیں بن سکتے۔ ہمیں فراخدلی سے اپنی کمزروی اور دوسروں کی اچھائی کا اعتراف کر چاہیے۔ اس سے دل مطمئن ہو جاتا ہے اور حسد باقی نہیں رہتا۔'' دو تین جگہ نوکری کے لئے جانے اور چند روز بعد وہاں سے ناکام۔ ہونے کے بعد جب میں دوبارہ مایوس صورت بنائے تنزیلہ اکرام کے روبرو پہنچا تو اس نے بڑے سچ سچ سے سمجھانے والے انداز میں تجزیہ کیا تھا۔

تنزیلہ نے یکے بعد دیگرے میرے لئے دو دو نوکریوں کا بندوبست کیا تھا مگر میں دو تین روز میں گھبرا کے واپس آ گیا۔

''واقعی' اچھی جاب حاصل کرنے کے لئے تجربے اور ذہانت کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے' میں اب ماننے لگا ہوں۔'' میں نے سر جھکا لیا۔

''آپ یوں کریں' کسی محکمے میں ٹیلی فون آپریٹر کی یا کچھ اسی طرح کی آسان سی جاب کیلئے کوشش کریں''

''جاب کوئی بھی آسان نہیں ہوتی میرے بھائی!'' وہ ہاتھ میں قلم گھماتی ہوئی ہلکا سا مسکرائی۔ ''ہماری مہارت جاب کو آسان بنا دیتی ہے اور پھر آج کل آسان سی جاب بھی آسانی سے نہیں ملا کرتی۔ تم چاہتے ہو' کوئی ایسی جاب ہو جس میں کام بھی کچھ نہ ہو اور تنخواہ بھی زبردست ہو۔ ایسا کہاں ممکن ہے۔ میری جہاں جہاں جان پہچان تھی' میں نے کوشش کر دیکھی۔ مزید کسی ڈیپارٹمنٹ میں میری واقفیت نہیں ہے پھر بھی تمہارے لئے ڈھونڈ کے دیکھ لیتی ہوں لیکن یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''شاہ نے بھی کچھ بندوں سے بات کی ہے' شاید کوئی بات بن جائے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

تحریم! ایک منٹ۔'' میں مڑنے کو تھا' جب اس نے اچانک پکار لیا۔ میں پلٹ کر استفہامی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کوئی پرابلم تو نہیں ہے تمہیں؟'' وہ قدرے ہچکچا کر میرے تاثرات ملاحظہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''کس قسم کی پرابلم؟'' میں نے انجانے پن سے سوال کیا' حالانکہ اس کی ہچکچاہٹ بذات خود اس کے ارادوں کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا مگر میرا خوددار دل اور انا اس سے پیسے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

''آج کل تم جاب لیس ہو۔ اور والدین کی طرف سے بھی کوئی سپورٹ نہیں۔ تمہارا دوست ایک کمرے کے کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے اور جیسا کہ تم نے بتایا ہے' کسی چھوٹی موٹی پوسٹ پر ہے۔ وہ پیسے کما کر اپنے گاؤں فیملی کو بھیجتا ہے۔ ایسے میں لازماً تمہیں پیسے کی تنگی ہوگی۔ ایسا کرو یہ کچھ رقم رکھ لو۔''

''نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی مٹھی میں دبے سرخ نوٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے قطعی انداز میں کہا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''ضد نہیں کرو تحریم' مجھے احساس ہے کہ تم ان دنوں یقیناً مشکل میں ہو' یہ کون سی بڑی رقم ہے۔ محض چھ سات سو روپے سے کیا بنتا ہے مگر چند دن بہر حال گزر جائیں گے اور اس دوران اللہ کے فضل سے تمہیں کوئی مناسب جاب مل جائے گی پھر بھلے سے واپس کر دینا۔''

''نہیں۔ میں نے کہا نا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے انکار کر دیا۔

''تحریم پلیز۔'' وہ شاکی اور بے بس نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے قدرے جھنجھلائی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' اس نے نوٹ میری شرٹ کی جیب میں ڈال دیے۔ میں نے نکالنے کی کوشش کی مگر اس نے ایسا ممکن نہ ہونے دیا۔

''یہ قرض سمجھ کر میری طرف سے رکھ لو۔ اچھے بھائی نہیں ہو؟ پاگل' تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ چھوٹوں کا حق بنتا ہے۔ اتنی غیریت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ دراصل اس وقت میرے پرس میں تھے ہی اتنے ورنہ یہ تو بہت معمولی سی رقم ہے۔''

میں نے بہت احتجاج کیا مگر اُس نے اپنی قسم دے کے مجھے چپ کرا دیا۔ یہ الگ بات تھی

کہ مجھے واقعی پیسوں کی ان دنوں سخت ضرورت تھی گویا کہ حق نواز شاہ بھی میرے لئے بہت کچھ کر رہا تھا' ہر ممکن طریقے سے میرا خیال رکھتا تھا مگر میں اس کے احسان کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا تھا۔ اس بے چارے کو اپنے گھر میں بھی تو بھیجنا ہوتا تھا۔ اس کی چار بہنیں کنواری گھر بیٹھی تھیں۔ باپ ریٹائرڈ کلرک تھا۔

اسی لمحے تنزیلہ کو سر کی طرف سے کال آ گئی۔

''تم یہیں میرے آفس میں بیٹھو' میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔''

وہ کچھ فائلیں اُٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ میں بیٹھ گیا۔ اسے گئے ہوئے تین چار منٹ گزرے ہوں گے' جب پیچھے سے دروازہ کھلا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔

وہ انتصار بھائی تھے غالباً کسی کام کے سلسلے میں تنزیلہ کے پاس سیکنڈ فلور پر آئے تھے۔

''تم..... تمہاری یہ جرات کہ تم اسٹار کو کمپنی کے آفس میں دوبارہ قدم رکھو۔'' مجھے دیکھتے ہی وہ آناً فاناً بھڑک اُٹھے۔

''کیا رشتہ بنتا ہے تمہارا تنزیلہ کے ساتھ۔ اس سے ملنے کیوں آتے ہو؟'' وہ شرربار نظروں سے دیکھتے ہوئے مشکوک انداز میں دانت پیس کر پوچھ رہے تھے۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جسم و جان میں شعلے سے دہکنے لگے۔

''یہ عمارت آپ کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ جب میرا دل چاہے گا' میں آؤں گا۔ آپ کے کمرے میں تو نہیں آیا۔ تنزیلہ کے پاس آیا ہوں اور یہ کیوں بتاؤں کہ میرا اُس سے کیا تعلق ہے۔ بات تو یہ ہے کہ آپ کا میرے اور اُس کے مابین رشتے سے کیا تعلق بنتا ہے؟ آپ کو اتنی کرید کیوں ہے۔''

''تم غالباً اس کے توسط سے نوکری حاصل کرنے کے چکروں میں ہو۔ سن لو کہ تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نوکریاں کرنے کے لئے بزدل گردہ چاہئے ہوتا ہے۔ تم جیسے زنانہ مزاج کے لڑکوں سے کہاں ہونے لگیں نوکریاں۔ تم میرے برابر پہنچنے کے جو خواب دیکھ رہے ہو' انہیں تعبیر کا حقیقی آئینہ بھی دکھا دو۔ تم تا زندگی میرے جیسے نہیں بن سکتے۔'' اُن کے لہجے میں میرے لئے ہتک تھی۔

"میں بننا بھی کیوں چاہوں گا۔" میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ "آپ جیسا بننے کے لئے کمینہ، خودغرض اور نفس پرست ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنے "گنس" کہاں؟"

میرا تمسخر اُڑاتا طنزیہ لہجہ اُن کو سرتاپا غصے کی آگ میں نہلا گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو گئے اور گالیاں بکنے لگے۔ اس وقت وہ کہیں سے بھی کسی مہذب معاشرے کے فرد نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک وحشت اور انتقامی آنچ برپا تھی، ایک ایک حرکت میں۔

اتنی دیر میں تنزیلہ واپس آ گئی۔ اُسے دیکھ کر وہ ٹھنڈے پڑ گئے اور پھر بات بنائے بغیر کمرے میں نکل گئے۔

"کیا ہوا تھا؟" پریشانی سے لبریز استعجاب تنزیلہ کے چہرے پر ثبت تھا۔ میں نے پیشانی پہ بل ڈالے ساری تفصیل کہہ سنائی جسے سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "خطرناک آدمی سے دشمنی مول لینا خطرے کو خود ہی دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، تمہیں ادھر آنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ ہم کہیں اور مل لیں گے آئندہ۔ فون نمبر تو ہے ناں، تمہارے پاس؟"

"آپ کیا بزدلوں والی باتیں کرتی ہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔ "میں نہیں ڈرتا ورتا کسی سے، دیکھ لوں گا سالے کو۔" میں نے خاصی بدلحاظی سے کہا۔

"سالا تو بلاشک وشبہ وہ تمہارا ہے۔" اُس نے بمشکل تمام اپنی مسکراہٹ روکی تھی۔ میں اپنی بات پر اڑا رہنا چاہتا تھا مگر تنزیلہ نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے نرم انداز میں سمجھاتے ہوئے مجھے آمادہ کر لیا۔

"مگر ہم ملیں گے کہاں؟" میں کوفت سے سر جھٹک رہا تھا۔ "ریسٹورنٹ اور ہوٹل وغیرہ میں آپ نہیں ملنا چاہتیں پھر؟"

"فی الحال تو فون پر رابطہ رہے گا، کوئی مناسب جگہ سوچ کے بتاؤں گی۔"

♥♥♥

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ مجھے ہنوز مناسب جاب نہیں مل سکی تھی۔ حق نواز شاہ کے ہاں فالتو بوجھ کی طرح پڑے پڑے اب تو شرم آنے لگی تھی۔ وہ غریب ایک لفظ بھی نہ کہتا تھا۔ اسی معمول سے میری دلداری میں لگا رہتا۔ اپنے طور پر وہ بھی اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

میں اس بے یقینی، مایوس کن صورت حال سے تنگ آ چکا تھا۔ اب تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ ٹیلی فون کال پی سی او سے کرنے کے لئے بھی پیسے نہیں نکلتے تھے۔ غنیمت تھا جو حق نواز کے دم سے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی سہولت میسر تھی۔ اس روز میں نے جیب میں پڑے آخری دس روپے نکالے اور قریبی پی سی او سے تنزیلہ کے گھر کا نمبر ملایا۔ اتفاقاً اس نے ریسیو کیا۔

"کیا آپ کل مجھے مل سکتی ہیں؟ میرا دل بہت اداس ہو رہا ہے۔ کسی اپنے کو دیکھنے کے لئے ترس گیا ہوں میں۔"

"کل، وہ متذبذب ہو کر بولی۔ "مگر کہاں؟"

"آ......آپ......" پھر میں کچھ سوچنے کے بعد ایک دم جوش سے کہنے لگا۔

"آ گئی ترکیب، آپ میرے دوست کے فلیٹ میں آ سکتی ہیں، صبح دس بجے؟"

اُدھر سے کچھ دیر کو خاموشی طاری رہی۔

"وہاں تو کسی کے دیکھ لئے جانے کا خطرہ نہیں رہے گا۔" میں نے اس کی تسلی کرائی۔

"مگر تمہارا دوست تو گھر پر ہی ہوگا۔"

"نہیں وہ صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک اپنے آفس میں ہوتا ہے۔"

"وہ مائنڈ تو نہیں کرے گا؟"

"کبھی نہیں۔ میں اُسے بتا دوں گا کہ کل میرے مہمان آئیں گے۔ وہ اللہ لوک بندہ ہے۔"

زیادہ کرید نہیں رکھتا۔ خاموش رہتا ہے۔ آپ اُس سے ملیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔ بہت قدر دانا ور بار لیش آدمی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں کل آفس سے چھٹی کر لیتی ہوں دس بجے سیدھی تمہاری طرف آ جاؤں گی۔ تم لوکیشن بتا دوں۔"

بالآخر وہ مان گئی۔ میں نے ایڈریس لکھوا دیا۔

واپس لوٹا تو رات گہری ہونے لگی تھی۔ میں کل کا انتظار کرنے لگا۔ نجانے کیوں اس سے ملنے اسے دیکھنے اس سے بات کرنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ غیروں کے اس دیس میں وہی تو ایک اپنی تھی۔

اس رات حق نواز خاصی دیر سے لوٹا تھا۔ گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ شاپر تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے شاپر کھولا۔ اس میں بوتل تھی۔

"شوق رکھتے ہو؟" اس نے برف کے کیوب گلاسوں میں ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔ میں دنگ رہ گیا۔

کبھی پینے کا اتفاق تو نہیں ہوا؟" میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ نظریں بوتل میں بند سیال پر جم گئی تھیں۔

"غم غلط کرنے کا بہترین ذریعہ ہے چاہو تو آزمائش کر دیکھو۔ میں مہینے کے مہینے لاتا ہوں۔ پی کر بدن میں چستی سی آ جاتی ہے۔ بے سکون نبضیں سکون پا جاتی ہیں۔"

"لاؤ پھر دے دو۔ یہاں تو سینے میں غم کی بھٹیاں دہک رہی ہیں۔" میرا دل بے ایمان ہو گیا۔

پہلے گلاس نے خاصی آفت مچائی تھی۔ سینے میں جلن ہونے لگی۔ بہت ناگوار سی بُو اور تلخی محسوس ہو رہی تھی۔ اولین گھونٹ لیتے ہی کھانسی شروع ہو گئی۔ سر چکرانے لگا۔ یوں لگا جیسے ابھی اُبکائی آ جائے گی۔ سینے میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔

"یہ بہت تلخ ہے۔" میں سینہ مسلتا ہوا بمشکل تمام بولا۔ "اس کی تلخی ہی تو اس کی تاثیر ہے۔ اندر کی تلخیوں کو پانی بنا کر بہا دیتی ہے۔ پہلا پہلا گھونٹ کڑوا لگتا ہے۔ پہلا گلاس ختم کرنا عذاب بن جاتا ہے مگر اس کے بعد یہ آبِ شریں بن جاتا ہے مگر اس کے بعد یہ آبِ شریں بن جاتا ہے اور

جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ پیو میرے یار پیو۔" وہ بہت سکون سے دوسرے کے بعد تیسرا پیگ چڑھا رہا تھا۔

میں نے اُس کے اصرار پر دوسرا جام بھرا۔ اور پھر واقعی آہستہ آہستہ اس کی تلخی اور ناگوار بُو ختم ہوتی گئی۔ یوں لگا جیسے میں بادلوں میں تیر رہا ہوں۔ اونچا بہت اونچا اُڑتا چلا جا رہا ہوں۔ آنکھوں میں خمار اُتر آیا تھا۔ جسم و جان اور اعصاب بہت ہلکے پھلکے محسوس ہو رہے تھے۔ خیال و خواب کی دنیا میں رنگین سراپے جگمگانے لگے تھے۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے تنزیلہ رحمٰن اپنے شاداب دن کی قیامت خیزیوں سمیت میرے قریب آنے لگی ہو۔ قریب بہت قریب۔ اسے چھونے کی کوشش میں میں نے بے قراری سے اُٹھ کر کھڑا ہونا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے ڈگمگاتا لہراتا ہوا فرش پر بچھی دری پر آ رہا۔ پھر اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہ رہی کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے کی واحد کھڑکی سے روشنی کی کرنیں چھن چھن کرتی اندر آ رہی تھیں۔ اچھا خاص دن چڑھ آیا تھا۔ حق نواز کی چارپائی خالی تھی۔ چابیاں میرے پیروں کے قریب پڑی تھیں۔ میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور پھر ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سوئیاں سوا نو بجا رہی تھیں۔

"آج تو تنزیلہ کو آنا ہے دس بجے۔" میں کسلمندی سے انگڑائیاں لینے کا عمل ترک کر کے اُٹھا تو یوں محسوس ہوا جیسے سر بہت بھاری ہو گیا ہو۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔ منہ کا ذائقہ عجیب کسیلا سا ہو رہا تھا۔

باتھ روم کے آئینے میں میں نے اپنی شکل بغور دیکھی۔ آنکھوں میں ابھی تک گلابی خمار چھلک رہا تھا۔ ٹائم نہیں رہا تھا اس لئے غسل لینے کا خیال ترک کر کے محض ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ مار کے نکل آیا اور کچن میں جا کر چائے بنانے لگا۔ دو کپ چائے تیار کر کے ابھی کپوں میں انڈیل ہی رہا تھا کہ بیل بجی۔

میں نے اپنے حلیے پر سرسری سی نگاہ کی۔ میلی سی اکلوتی سفید جینز پہ سیاہ ٹی شرٹ پہنے اپنے کنگھی سے محروم لہریے دار براؤن اُلجھے ہوئے بالوں اور بہکی بہکی سرخیاں جھلکاتی براؤن آنکھوں سمیت بڑا بے اوسان اور بے چین سا لگ رہا تھا۔

"خیر وہ تو اپنی ہی ہے۔" میں چائے کے کمرے میں موجود اکلوتی ٹیبل پر رکھ کے تیزی سے

دروازے کی سمت گیا۔ دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کر ایک دم ٹھٹک سا گیا۔

''اوہو! آج تو لوگ بہت چمک رہے ہیں'' سلام دعا کے بعد اُسے اندر کمرے میں لے کے آیا تو شرارت سے فقرہ کسنے لگا۔

''ہمیشہ کی طرح ویسے کی ویسی ہوں' اپنی آنکھیں ٹیسٹ کراؤ۔'' وہ ازلی پُرسکون بشاش انداز میں اردگرد کا سرسری نگاہ سے جائزہ لیتے ہوئے بے پروائی سے بولی۔

''مگر مجھے آج کچھ اور ہی دکھائی دے رہی ہیں۔'' میری نظریں بدستور اس کے سراپے سے اُلجھ رہی تھیں۔ ہلکے سبز ٹھنڈے رنگ کے سادہ سوتی لباس میں اس کا ملاحت سے بھرپور چہرہ بہت تروتازہ لگ رہا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ ریشمی بال ہمیشہ کی طرح ربر بینڈ میں مقید ہونے کے بجائے کھلے تھے اور شانوں اور گردن کے آس پاس اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اس کے بال لمبے نہیں تھے مگر سیدھے اور سلکی تھے اور آگے پیچھے لہراتے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ ایک موٹی گھونگریالی لٹ ہمیشہ کی طرح بائیں گال کو چھو رہی تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر نیچرل شیڈ کی لپ اسٹک اس کا واحد سنگھار ہوتا تھا۔ لپ اسٹک بہت جچ رہی تھی اس کے ترستے ہوئے ہونٹوں پہ۔ اس کا سراپا متناسب اور اسمارٹ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل فٹ فاٹ رکھا تھا۔ اس لئے اپنی عمر سے بھی کم دکھائی دیتی تھی۔

''سنیئے۔ آپ شادی کے بارے میں کب سنجیدگی سے غور کریں گی۔'' میں نے اچانک کہا۔ آخر اُن میں کیا کمی تھی جو اس سلسلے میں اتنی تاخیر کر رہی تھیں۔

''تمہیں بھی پڑ گئیں' بھائیوں والی فکریں۔'' وہ جھینپ کر بولی۔ ''میں نے ان فضولیات کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔''

''یہ تو نری جذباتیت ہے۔ شادی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔'' میں نے اس کی شرمیلی ادا سے لطف لینے کی خاطر کہا۔

''اُن کے لئے ہوتی ہوگی جن کا مقصد نفس کی تسکین ہوا کرتا ہے۔'' وہ سر جھٹک کر بے نیازی سے بولی۔

''ساری بات یہ ہے کہ آپ کسی کی خاطر خود پہ قدغن لگائے ہوئے ہیں۔'' میں نے وثوق سے کہہ کر اس کا چہرہ جانچا۔

وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

''یہ بات نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں مصنوعی قطعیت تھی۔

''یہی بات ہے یا تو آپ کو کسی کے آنے کا انتظار ہے یا پھر کسی کی محبت میں اتنی دور نکل گئی ہیں کہ اُس کی جگہ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتیں۔ کوئی بات ہے ضرور۔ آپ کے کترانے بچانے کی ادا بہ زبانِ خود کہتی ہے۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔

''آخر کون سی خاص شخصیت ہے جسے آپ پس پردہ رکھنا چاہ رہی ہیں۔ بتانے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ کہیں ان موصوف نے قسم تو نہیں دے رکھی؟'' میں نے اُگلوانے کی کوشش میں ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ صفائی سے نگاہ بچا گئی۔

''کہا ناں' ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ہو بھی تو گڑے مردے اُکھاڑنے سے فائدہ۔''

''تو آپ مان رہی ہیں ناں کہ ایسی ہی کوئی بات ہے ضرور۔'' میں نے جوشیلے پن سے کہا۔ وہ متذبذب سی ہو کر اُنگلیاں چٹخانے لگی۔

''بتائیں ناں۔'' میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ ''مجھے یقین ہے' آپ کی پسند بھی آپ ہی کی طرح اعلیٰ ہوگی۔'' میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر وہ کچھ کچھ مضطرب سی ہوگئی تھی۔ ''یقیناً کوئی ہائی فائی ڈیگنی فائیڈ سوبر سی پرسنالٹی ہوگی۔'' میں ہوشیاری سے بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے چین سی ہو کر اپنی ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

''پہلے سے تصورات نہیں باندھا کرتے حقیقت جانے بغیر۔'' وہ سر جھکا کر اُلجھے ہوئے انداز میں بولی۔

''حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہی کب ہیں آپ۔'' میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

''میں سمجھ گیا ہوں' آپ کی اسکیم۔ آپ جان بوجھ کے مجھے اپنے بارے میں بے خبر رکھنا چاہتی ہیں۔ اپنا نہیں سمجھتی ہیں ناں۔'' میں نے ناراضگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی۔

''کیا حماقت ہے بھئی۔'' وہ مجھے منانے کو نرمی سے مسکرا دی۔ ''اس طرح روٹھے ہوئے بالکل غبارہ لگ رہے ہو' بھئی کوئی بات نہیں ہے۔ بتانے کو کچھ ہو بھی۔'' اس نے دو تین بار مجھے آواز دی مگر میں منہ کو تالہ لگائے بیٹھا رہا۔ بالآخر اسے کرسی چھوڑ کر نیچے دری پہ قریب آنا پڑا۔

''اچھے میزبان ہو۔ دیکھتے ہی منہ بسور کے بیٹھ گئے۔'' پہلے وہ پاس کھڑی منانے کی سعی کرتی رہی پھر تھک ہار کر دری پر میرے مقابل بیٹھ گئی۔ اور ہلکے سے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا۔

''اللہ خیر کرے' کہیں اشل تو نہیں گئے۔ چیک کرلوں؟''

''بہت پکی ہیں آپ' اپنا راز تو نہیں دیں گی۔'' مجھے بالآخر مانتے ہی بنی۔ مسکرا کر اسے نرم نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا تھا۔

''شاید آپ کی انا اور عزت نفس اجازت نہیں دیتی۔ آپ کو یہ بات قابل ملامت لگتی ہوگی کہ جس کے بارے میں آپ مجھے روکتی ٹوکتی رہتی ہیں' لیکچر دیتی ہیں' ان بے تاب جذبات واحساسات پر مشتمل تجربے سے آپ بھی گزر چکی ہیں۔ آپ نے بھی ایک زمانے میں زمان ومکان کی پروا کیے بغیر بے خطر' کسی کے لیے اپنا دل ہارا تھا' اپنا چین سکون تباہ کیا تھا' مگر شاید قسمت نے آپ کا ساتھ نہیں دیا اور میرے ردّعمل کے برعکس بغاوت کے رستے پر چلنے کی بجائے آپ نے اس سانحے پر صبر کرلیا۔''

''گھڑتے جاؤ خود سے کہانی' لمبی لمبی چھوڑنے کی تو تمہیں ویسے بھی عادت ہے۔'' اس نے میری بات کو مزاح کے رنگ میں اُڑانا چاہا تھا مگر اُس کا لہجہ کمزور تھا۔ وہ اس کی مخصوص مضبوطی اور قطعیت یکسر غائب تھی۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ دیکھو' میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔'' اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر میز سے سیاہ شاپر اُٹھالیا۔ میں نے بے دلی سے کھولا۔ اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو بھئی' یہ بی اے کے کورس کی کتابیں ہیں اور یہ تمہارے لئے ہین۔ اللہ نے چاہا تو کچھ دنوں میں تمہارے لئے جاب کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ دن کی نوکری کرنا اور رات کو پڑھائی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے بھئی۔'' میں ہنس پڑا۔ ''مجھے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔'' ہولے سے بالوں مین ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے دیوار سے ٹیک لگا کر سکون سے اپنے مقابل دری پر بیٹھی تنزیلہ کو دیکھا تھا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' اس نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

''پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے مائی ڈیئر!'' میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر انہیں پشت کی جانب دیوار سے لگا کر ان پر اپنا سر رکھ لیا۔

''کیا مطلب ہے' انسان کس لئے پڑھتا ہے؟'' اس نے گھور کر دیکھا۔ انداز میں غصے بھری حیرانی تھی۔

''یاد رکھو' تعلیم ہی سے انسانی کی قدر و عزت اور پہچان ہوتی ہے۔ بھلے سے وہ لاکھوں میں کھیل رہا ہو مگر تعلیمی قابلیت کی پائی پائی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے بڑا ارمان ہے کہ تم پرائیویٹ ہی سہی مگر تعلیم ضرور حاصل کرو' اس سے تمہاری سوچ اور شخصیت میں نکھار آجائے گا اور تم زیادہ بہتر انداز میں حقائق کا تجزیہ کرسکو گے۔

''پھر کیا ہوگا' اس سے مجھے کیا ملے گا؟'' میں ہٹیلے انداز میں بولا۔

''تحریم! جب تم اس طرح سطحی انداز میں سوچتے ہو تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں تمہیں بہت اعلیٰ انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایک اچھا انسان ہمیشہ مثبت انداز فکر رکھتا ہے۔ وہ مایوسیاں شمار نہیں کرتا۔ اپنے حوصلے اور ہمتیں جوان رکھتا ہے۔''

''آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔ انڈیا کی ایک اداکارہ سے ملتی ہے' کیا نام ہے اُس کا۔'' میں ذہن پر زور دیتے ہوئے یاد کرنے لگا۔

''تحریم!'' وہ شدید ناراضگی کے عالم میں مجھے دیکھنے لگی۔

''میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم مجھے کہاں کی سنا رہے ہو۔ اتنی ڈھٹائی بھی اچھی نہیں ہوتی۔''

''یار' سچ کہہ رہا ہوں میں' آپ کی آواز کا ردھم' لوچ اور گداز بڑا متاثر کن ہے۔ کانوں کو بھلا لگتا ہے۔''

''خیریت تو ہے ناں' جب سے آئی ہوں' تم مسلسل تعریف کر رہے ہو۔ کوئی کام تو نہیں نکلوانا۔؟'' وہ جھینپ مٹانے کی خفگی سے بولی۔

میں دلچسپی سے اس کے شرماتے لجانے کی ادا سے محفوظ ہو رہا تھا۔

''آپ کا پیار ہی بہت کافی ہے ہمارے لئے۔'' میں نے یونہی اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔

وہ بے مقصد انداز میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ہاتھ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ میری نرم نرم سی سرگوشی پہ وہ رواداری سے مسکرا دی تھی۔

''آپ مسکراتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' دھیرے سے کہتے ہوئے بے اختیار میری نگاہ اُس کے بھرے بھرے گلابی ہونٹوں پر جم گئی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ کے وسط میں کھینچی لائیں جنس مخالف کو بے ساختہ گستاخی پر اُکساتی تھیں۔ ان گہری عنابی لائینوں میں ایک ترغیب' ایک بہکا دینے والی اشارت پوشیدہ تھی۔

''کیا آپ کو میرے منہ سے اپنی تعریف سننا اچھا نہیں لگ رہا۔'' میں نے دبے لہجے میں کہتے ہوئے سیدھا اُس کی شفاف سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔

''جھوٹی تعریف صرف بے وقوف آدمی کو خوش کر سکتی ہے۔ تم جانتے ہو' میں اس کی قسم کی خرافات کی قائل نہیں ہوں۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔

''لڑکیاں تو اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ بلکہ تعریف سننے کے لئے ہی تو فیشن کے تمام تر لوازمات استعمال کرتی ہیں۔''

میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہوں' مجھے تعریف نہیں' انسانیت کا بے لوث مظاہرہ خوش کرتا ہے۔ یہ جو ہر خود میں اور دوسروں میں دیکھ کر جی بھر کے خوش ہو جاتی ہوں۔ تمہارا دوست کب تک واپس آتا ہے؟''

شام چھ بجے کے بعد۔'' میں جواباً کہا۔

''آپ کون سی خوشبو استعمال کرتی ہیں؟'' وہ چونکہ دری پہ میرے عین سامنے بہت کم فاصلے پہ دوزانو......بیٹھی ہوئی تھی اس لئے اُس کے بدن سے اُٹھتی بھینی بھینی مدھم خوشگوار مہک ہوا کے دوش پہ سیدھی میرے نتھنوں کی چھو رہی تھی۔

''وہی جو ہمیشہ سے استعمال کرتی آئی ہوں۔ کیوں؟'' اس نے کچھ تحیّر سے مجھے دیکھا۔ غالباً سوال کا مقصد جاننا چاہ رہی تھی۔

''بہت دلفریب مہک ہے۔ دھیمی دھیمی اور سحر انگیز۔'' میں نے اس کی جانب جھک کر ایک طویل سانس بھر کر مہک اپنے انداز سموتے ہوئے کہا۔

''تم تو پاگل ہو۔'' وہ کتابیں سیٹ کرتی ہوئی بے نیازی سے بولی۔

''ہاں تو آپ جیسے لوگوں نے ہی تو پاگل بنایا ہوا ہے' ہمیں۔'' میں لہک کر بولا۔

''مجھے کیوں الزام دیتے ہو' تنزیلہ رحمٰن کا نام لو ناں' سیدھی طرح۔'' وہ بدستور مصروف سے انداز میں بولی۔ پھر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی سمت دیکھا۔

''اوہو۔ ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا ہے۔ چلتی ہوں اب۔'' اس کے ساتھ ہی اُس نے اُٹھ کر کھڑا ہونا چاہا۔

''اونہوں' میں آپ کو ابھی نہیں جانے دوں گا۔ بیٹھیں ناں' میرے پاس۔'' میں نے مچل کر اس کا ہاتھ تھام کر بٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر اس کے ہاتھ کی بجائے اس کے لمبے چوڑے سبز کاٹن کے دوپٹے کا پلو میرے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ چونکہ اپنے دھیان میں ایک دم کھڑی ہوئی تھی اس لئے اس کا شانوں پر پھیلا ہوا دوپٹہ پورے کا پورا پلو سے کھنچتا ہوا میرے ہاتھوں میں آ گیا۔

اب وہ بغیر دوپٹے کے سرو قد میرے سامنے کھڑی تھی۔ یونہی میری نگاہ اس کی سمت اٹھی تھی اور پھر میں نے محسوس کیا' جیسے میرے جسم میں چیونٹیاں سے رینگنے لگی ہوں۔ میں نے ایک دم جھرجھری لی۔ میری جائزہ لیتی ہوئی آنکھوں میں سرخ ڈورے مزید نمایاں ہو گئے۔ چھبیس ستائیس سال کی بھرپور عورت کا شباب اور گداز میرے سامنے تھا۔

جانے کیا ہوا' مجھے خود سے ڈر لگنے لگا۔ اپنی رگوں میں دوڑتے آتشیں سیال نے ایک آگ سی بھڑکا دی تھی۔

''اوہو۔ بالکل ہی بچے بن جاتے ہو تم۔'' اس نے اسی بے نیازی اور لاپروائی سے کہتے ہوئے تیزی سے جھک کر دوپٹہ اپنے شانوں پر برابر کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ گویا میری گزارش قبول کر لی تھی۔

''آپ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں؟'' میں کرسی کے قریب دوزانو بیٹھتے ہوئے کرسی کے ہتھے پر پڑے' اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر رسان سے بولا۔

''جتنا بہنیں اپنے بھائیوں سے کیا کرتی ہیں'' اس نے نرم مسکراہٹ سے جواب دیا۔

میں کچھ مضطرب سا ہو کر اس کی انگلیاں سہلانے لگا۔ میری سوچ کا دائرہ کہیں اور بکھرا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سا لاوا سینے میں پک رہا تھا اور بہہ جانے کو بے تاب تھا۔ مجھے لگا' جیسے میرا حلق

خشک ہوا جا رہا ہو۔ مجھے تشنگی کا شدید ترین احساس ہو رہا تھا۔ وہی حس پھر جاگنے لگی تھی جسے بڑی مشکلوں سے سلایا تھا اور ضبط کے بند باندھے تھے۔ میرا چہرہ تانبے کی طرح دہکنے لگا تھا۔

''کن سوچوں میں گم ہو بھئی؟'' وہ میری خاموشی سے اکتا کر پوچھ بیٹھی۔ ''اور یہ میری انگلیوں نے کیا قصور کیا ہے جو ان کو مروڑ رہے ہو؟''

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر ہاتھ چھڑانا چاہا مگر میں گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ یہ لمس جانی پہچانی تسکین کی راہیں دکھلا رہا تھا۔ ایمان متزلزل کر رہا تھا۔ میں نے جھٹکے سے سر اُٹھا کر بغور اُس کو دیکھا۔ مجھے یوں لگا' جسے میری آنکھیں اور ہونٹ سلگنے لگے ہوں۔ ایک جانی پہچانی مانوس طلب انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔

''کیا ہے بھئی۔ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' اور یہ آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں۔ رات جاگتے رہے ہو کیا؟''

وہ میری اس قدر جوشیلی اور گہری نظر سے جز بز سی ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں میں خون کے ڈورے تیرنے لگے تھے۔

''ہاں۔ آپ کی یاد میں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہہ کر اُس کی طرف دیکھا۔ میں اس کے ردّعمل کی نوعیت جاننا چاہتا تھا۔

وہ سر جھٹک کر مسکرا دی۔ اس کے بے نیاز انداز میری مسلسل حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ گویا وہ میری ''لائن'' پر جا رہی تھی۔ میں نے اس کا عندیہ پا کر ایک اور جسارت کر ڈالی۔ ہولے سے ہاتھ بڑھا کر بائیں گال پہ جھولتی ہوئی گھونگریالی لٹ کر انگلی پر لپیٹنے لگا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟'' اس نے دوسرے ہی لمحے میرا ہاتھ جھٹک کر اُلجھے ہوئے برہم انداز میں تحیر سے میری جانب دیکھا تھا۔

میں اس کے غیر متوقع ردّعمل سے گڑبڑا سا گیا' تاہم اپنی شوخیاں ترک نہیں کیں۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے طیش زدہ سی مجھے گھور رہی تھی۔

''ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ لاڈ کر رہا ہوں آپ سے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اچھا لاڈ ہے یہ۔ اور کسی کی نظر پڑ جائے تو مصیبت پڑ جائے گی۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں

وہ میری گستاخی پر مشتعل تو تھی مگر اپنی فطرت اور رشتے کی نزاکت کی بدولت غصہ پی کر بات کو عام تاثر دی رہی تھی۔

''یہاں بند کمرے میں کون دیکھنے والا ہے۔ ویسے آپ کے ہاں کچھ زیادہ ہی مصیبت نہیں پڑتی۔'' میں چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ مصیبت پڑ جائے گی جیسیا س کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔

''جب تک تم جیسے مصیبتیں پیدا کرنے والے لوگ زندہ ہیں' مصیبتیں تو پڑتی رہی گی۔ اچھا۔ اب میں چلتی ہوں' بارہ بج رہے ہیں۔ انتصار صاحب نے دس دفعہ بندہ بھیجا ہوگا' میرے ڈیپارٹمنٹ میں۔ اور مجھے یقین ہے کہ گھر بھی فون ضرور کیا ہوگا۔ ویسے بھی اُسے شک ہو گیا ہے کہ تمہارا مجھ سے خفیہ رابطہ ہے۔ یہ نہ ہو' وہ تازہ ترین اسکینڈل کی تلاش میں ہمیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلے۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔''

''آپ ان سے کیوں خوف کھاتی ہیں۔'' میں جھنجھلایا تھا۔

''مجھے یوں لگتا ہے' جیسے انتصار بھائی کا آپ کے ماضی سے گہرا تعلق رہا ہو۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' اُس نے سختی سے جھڑک دیا۔ اس کا چہرہ متزلزل ہو رہا تھا۔ اس نے نظریں نہیں اُٹھائی تھیں۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

وہ جونہی کھڑی ہوئی' میں نے اُس کے کندھے تھام لئے۔

''آپ جا رہی ہیں؟ مجھے یونہی تشنہ چھوڑ کر؟'' میرا لہجہ سلگ رہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے ناسمجھی کے عالم میں حیرانی سے دریافت کیا۔ جواب میں میرے ہاتھوں کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔

''مجھے اپنے پیار سے سیراب کر دیں تنزیلہ۔'' میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کے ساتھ ہی میرے پورے جسم میں بھی شدت جذبات کے باعث لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

''کیا کہہ رہے ہو بھائی۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔'' وہ اب بھی کچھ اندازہ لگانے میں ناکام رہی تھی۔

''مجھے آپ اپنا پیار دے دیں۔ میرا من بہت پیاسا ہے' تنہا ہے' آپ میری بکھری ہوئی ہستی کا سامان بن جائیں۔'' میں جنون کے عالم میں جانے کیا کیا بک رہا تھا۔

''تم مجھے ہوش میں نہیں لگ رہے۔ کہیں پی تو نہیں لی؟'' وہ عجیب بے یقین پریشان

نظروں سے میری وحشتوں کا نظارہ کر رہی تھی۔

"ہاں میں نے پی لی تھی رات' تھوڑی سی۔" میں نے اعتراف کیا۔ میری سانسوں میں گھلی شراب کی بو بذات خود اپنی موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔

"کیا......!......!" اس نے جھٹکے سے میرے ہاتھ ہٹاتے ہوئے شدید غیظ سے دیکھا۔

"تو اسی لئے اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔ آنکھیں بھی انگارہ بنی ہوئی ہیں۔"

پھر وہ غصے سے کانپتی ہوئی تادیر لیکچر دیتی رہی۔ مگر اس وقت میرے پلّے اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑا۔ کچھ اتنے عرصے کی پرہیز گاری اور احساس ناکامی۔ دوسرے شراب کی فتنہ پردازیاں۔ میری ستھری بچی سوچیں نفس کے زہر سے آلودہ ہو چکی تھیں۔

مکمل تنہائی' بند کمرہ' اور بھرپور شباب عورت کا ساتھ' جس کے وجود سے اُٹھتی مہک مجھے مست و بےخود کئے جا رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے رسیلے ہونٹ میرے جذبات میں ہلچل مچانے لگے۔ اس کا گداز سراپا میرے لیے امتحان بن گیا۔

میں اس وقت تمام اعلیٰ ترین اخلاقی وسماجی اور مذہبی اقدار فراموش کر چکا تھا۔ یہ بھی فراموش کر دیا تھا کہ مقابل کھڑی عورت سے میرا کیا رشتہ بنتا ہے۔ اس وقت بند کمرے میں صرف دو کردار تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔

"بولیں' دیں گی ناں مجھے اپنا پیار۔" میں دوبارہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے مخمور انداز میں پوچھا۔

"یہ پیار تو پہلے ہی تمہارے لئے ہے۔ تم میرے چھوٹے بھائی جو ہوئے۔" اُس نے اپنا اضطراب چھپاتے ہوئے بہادری سے مسکرا کر جواب دیا اور قدم دروازے کی سمت موڑنا چاہے۔

"نہیں' مجھے یہ والا پیار نہیں چاہیے؟" وہ واضح طور پر اپنی حیران پریشان ہراساں کیفیت چھپانے میں ناکام ہوگئی تھی۔ اس کے لہجے میں نامعلوم سی لرزش ہویدا تھی۔ آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

"وہی جس کا ایک مرد اور عورت کے درمیان لین دین ہوتا ہے۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیرے سے جھک کر گویا دھماکا کیا۔ وہ صدمے اور استعجاب کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ کر ساکت سی رہ گئی۔ وہ حیرت سے ٹکر ٹکر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟" بہت دیر بعد وہ بولی تو یوں لگا' جیسے کسی کنوئیں سے آواز برآمد ہوئی ہو۔ اس کی پتھرائی ہوئی بےیقین متوحش آنکھیں میرے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔

"شراب نے تم سے اپنے بُرے بھلے اور رشتے ناتے کی تمیز بھی چھین لی ہے۔ اسی لئے تو اسے اُمّ الخبائث کہا جاتا ہے۔ کیا تم جانتے ہو' میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔ یاد کرو تم نے مجھے بہن بنایا تھا۔ بھائی ہو تم میرے۔ نشے میں سب ادب وآداب بھلا بیٹھے ہو۔"

وہ دُکھ کی انتہا پر روہانسی نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بمشکل تمام بول رہی تھی۔ مگر مجھے اس وقت کسی شے کا ہوش نہیں تھا۔ میرے لئے یہی بہت تھا کہ میری جسارت پر وہ آگ بگولہ ہو کر مجھ پر جھپٹی نہیں تھی۔ ابھی تک زبانی کلامی ہی وعظ ونصیحت کر رہی تھی۔ گویا پیش قدمی کر کے اس کو اپنی گرفت میں لے کر ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا۔ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ زیادہ مزاحمت نہیں کرے گی۔ ظاہر ہے' دل سے وہ بھی میری قربت کی طالب ہو گی۔ کتنی بار میری خوبصورتی کا اعتراف کر چکی ہے۔ اپنی مسکراہٹ کے پھول نچھاور کرتی ہے' نرم نرم جذبوں سے لبریز آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہے۔ دل میں یقیناً میری کشش کی اسیر ہو چکی ہو گی۔ اور میری طرح وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہو گی کہ ابتداء میں بہناپے کے نام سے بنایا جانے والا یہ رشتہ اب طلب کے انوکھے رنگ اختیار کر چکا ہے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں کھینچنا چاہا مگر وہ مچھلی کی طرح پھسل گئی۔ میں کمرے کا لاک لگا چکا تھا اور چابی جیب میں تھی۔ گویا وہ پوری طرح دسترس میں تھی۔ اور اس وقت بےبس تھی۔

"مجھے آپ سے بہن بھائی والا پیار نہیں چاہیے' وہ پیار چاہیے جو وجود میں رکھتا ہو۔ جسے محسوس کیا جا سکے۔ اگر آپ مجھ سے واقعی پیار کرتی ہیں تو آج اس کا ثبوت فراہم کر دیں۔"

میں نے بپھرے ہوئے جذبات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے دیوانگی سے کہا۔

"تحریم! پلیز' اتنا مت گراؤ مجھے میری نظروں سے۔" وہ دیوار سے لگ کر دونوں ہاتھ آگے کر کے گویا پیش قدمی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یاد کرو' تم تنزیلہ رحمٰن سے پیار کرتے ہو۔" وہ بُری طرح شپٹائی ہوئی تھی۔

"میں اس سے محبت نہیں بلکہ نفرت کرتا ہوں۔" میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی

غرا کر بول پڑا۔ ''اس نے میری زندگی تباہ کر ڈالی۔ میری تعلیم کے قیمتی سال ضائع کر دیے۔ مجھے گھر سے بے گھر کیا۔ مجھے ان حالوں تک پہنچا دیا کہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی۔ آج میرے پاس زہر کھانے کو بھی پیسے نہیں جیب میں۔ فقیروں سے بدتر حالت ہے میری۔ مجھے نفرت ہے' اُس کے نام سے' اُس کے وجود سے' اُس کے تصور سے۔ میں اس نام کی ہر لڑکی کو تباہ کر ڈالوں گا۔ سب سے بدلہ لوں گا اپنی بربادی کا۔''

میرے لہجے میں جیسے کوئی درندہ چنگھاڑ رہا تھا۔ میں عقل و خرد کی دنیا سے مکمل طور پر بیگانہ ہو چکا تھا۔ اسے میری نگاہ کی دیوانگی سے خوف آنے لگا۔

''مجھے کس بات کی سزا دینا چاہ رہے ہو۔ میرے خلوص کی' ہمدردی کی' میری سادگی کی؟'' وہ شاک کی سی کیفیت میں بولی۔

''سزا کب دے رہا ہوں' صلہ دینا چاہتا ہوں آپ کی تمام تر عنایاتکا۔'' میں نے عجیب۔ ہی نظر اُس پر ڈالی۔ میری نظروں میں اُمنڈتی مردانگی اس کے اوسان خطا کرنے لگی۔

''مجھے برباد کر کے کون سا ''تاج'' پہناؤ گے مجھے' ذلت کا؟ بدنامی کا؟ یا موت کا؟''

''آپ کو رانی بنا کر رکھوں گا۔ شادی کرلوں گا آپ سے'' میری سانسیں بکھری جارہی تھیں۔ وہ ششدر سی مجھے دیکھتی رہ گئی۔ اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''شادی کر کے کہاں چھوڑ دو گے مجھے' دارالامان میں؟'' وہ بھرّائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کوٹھی میں رکھوں گا آپ کو۔'' میں بہکے ہوئے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

''وہی کوٹھی جو تصورات میں تم بناتے رہتے ہو؟'' اس نے حد درجہ طنز سے مجھے دیکھا۔

''جہاں کہو گی' وہیں لے جاؤں گا' اب تم زیادہ نہ ترساؤ' جانم' میرا سینہ تمہارا منتظر ہے۔'' میں بانہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھا۔ نفس کے تقاضے مجھے بے چین کیے دے رہے تھے۔ وہ خوف سے شل ہو کر دیوار سے لگی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''نہیں پلیز۔ نہیں'' اُس کے ہاتھ اُٹھا کر ڈرے ڈرے ملتجی انداز میں پکارا۔ مگر میرے اندر کا وحشی مرد پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں بڑے مجنونانہ انداز میں اُسے بازوؤں میں لے کر اُس پر جھک گیا' اپنے نفس کی تسکین کے لئے۔ اب میں آزاد تھا۔

''آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان سگا رشتہ نہیں ہے۔ ہم کون سی ایک ماں کی اولاد ہیں۔ یہ رشتہ تو احساساتی سطح پر قائم کیا گیا تھا۔ سو احساسات بدل بھی تو سکتے ہیں۔''

دست جارحیت بڑھاتے ہوئے جونہی میری نگاہ اُس کے چہرے کے کھنچے ہوئے ناقابل قبول اذیت ناک وحشت زدہ تاثرات پر پڑی تو میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔ میں اسے کی رضا سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آج تک مجھے پیش قدمی کرتے ہوئے جنس مخالف کی سمت سے مکمل وابستگی اور خود سپردگی کا رسپانس ملا تھا۔ کسی نے مجھے رسماً بھی نہیں دھتکارا تھا۔ ہمیشہ مجھ پر دیوانہ وار اپنا پیار نچھاور کیا تھا۔ میں نے محبت سے زیادہ محبوبیت کے مزے لوٹے تھے' سو اس وقت بھی اسی ہی فضا قائم کرنے کے لیے عارضی طور پر وحشتوں کے اظہار پر بند باندھ دیے۔

''میں اس دن پہ شرمندہ ہوں' جب بہن بننے کی پیش کش قبول کی تھی۔ شرم آرہی تھی مجھے اپنے آپ سے۔ تم نے مجھے خود سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رکھا۔ جی چاہتا ہے' تمہارا گلا دبا دوں۔ یہ جواز پیش کرتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپا؟'' وہ شعلہ بار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ انداز میں زمانے بھر کا تنفر اور غیظ تھا۔

''سچ ہے' خون اپنا اثر دکھاتا ہے۔ میں پہلے یہ بات نہیں مانتی تھی مگر اب اس پہ ایمان لے آئی ہوں۔ تم ہو تو اسی خاندان کے فرد جس میں لتصار جیسے شرابی کبابی اور عورت خور مرد پائے جاتے ہیں۔ ان کے کزن ہو۔ زیادہ نہ سہی' کچھ نہ کچھ اثر تو لینا ہی تھا' خاندانی روایات کا۔'' اس کا لہجہ زہر آلود تھا۔

میں چپ چاپ اُس کے دلکش ہونٹوں کی جنبش پہ نگاہ جمائے ہوئے تھا' گویا ارد گرد کے

ماحول سے قطعی لاتعلق تھا۔

"کبھی اخبارات میں ایسے واقعات پڑھا کرتی تھی کہ منہ بولے بھائی یا بیٹے نے مقدس رشتے کا تقدس مجروح کر ڈالا۔ منہ بولے بھائی نے بہن کی عزت کا جنازہ نکال دیا' وغیرہ وغیرہ مگر مجھے ان کی سچائی پر یقین نہیں آتا تھا۔ میرا نظریہ تھا کہ اخبار والے مبالغہ آرائی کرتے ہیں' جھوٹ کا طوفان لکھ ڈالتے ہیں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک اتنا محرم' اتنا مقدس رشتہ ہوس کی بھینٹ چڑھ جائے۔ جب زبان سے کہہ دیا' دل سے اقرار کرلیا تو وہ رشتہ خون کے رشتوں جتنا معتبر ہوجاتا ہے' خود بخود۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ آج مجھے اندازہ ہو کہ مرد گھر کی چار دیواری تک باپ بیٹا' بھائی یا شوہر ہوتا ہے۔ گھر سے باہر نکل کر وہ صرف ایک مرد رہ جاتا ہے۔ کسی کا باپ یا بھائی نہیں ہوتا۔ اس طرح عورت بھی صرف گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹی' بہن' بیوی' بہن یا ماں کے نام سے عزت پاتی ہے۔ گھر سے باہر نکل جانے والی زمانے کے لیے صرف ایک عورت ہے اور کچھ نہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر تم نے اسی طرح نفس کی کمزوری کا شکار ہو کر اپنی اصلیت دکھانا تھی تو اس کے لیے بہناپے کا ڈھونگ کیوں رچایا؟ جس رشتے کو نبھانے کے تم اہل نہیں تھے' اس کو بنانے کی ابتدا کیوں کی؟ شاید اس لیے کہ تمہارا مدعا تنہا عورت کا قرب پانا تھا۔ تم لڑکیوں کو اپنی مٹھی میں دیکھنا چاہتے ہو۔ چاہے وہ کسی بھی طرح دام میں آئیں۔ میں نے دوست بننا قبول نہیں کیا تو تم نے وقتی تسکین کی خاطر بہناپے کا چکر چلالیا۔"

وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی۔ اس کا بھیگا ہوا روہانسا انداز' غصے سے سرخ چہرہ اور شعلے اگلتی شفاف آنکھیں جیسے چنگاریاں برسا رہی تھیں۔

"مجھے اس وقت کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ مجھے صرف تمہاری گداز قربت چاہیے اور بس۔" میں نے بہکتے ہوئے اس کو تھاما۔ عین اسی لمحے کمرے کے دروازے پر تیز دستک ہونے لگی۔

میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

حق نواز شاہ اس ٹائم کبھی بھی نہیں آسکتا تھا۔ اردگرد کے محلے میں کسی سے میری جان پہچان نہیں تھی پھر یہ کون ہوسکتا ہے!

دستک دوبارہ ہونے لگی۔

میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں تنزیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ برق رفتاری سے چارپائی سے

اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے لیے یہ انجانی دستک گویا مدد غیبی ثابت ہوئی تھی۔ دروازہ تو کھولنا ہی تھا سوچا چار وسوسوں سے دھڑکتے دل سے لاک ہٹا دیا اور پھر آنے والے کو دیکھ کو طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"میں نے ایک ضروری فائل بھول گیا تھا۔ سر نے مانگی تو یاد آیا کہ اسے تو گھر ہی چھوڑ آیا ہوں سو ایمرجنسی میں آنا پڑا۔"

وہ حق نواز شاہ تھا اور وضاحت کرنے کے بعد معذرت طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا پھر ایک دم اس کی نظر تنزیلہ پر پڑی۔

"یہ تنزیلہ ہیں۔ جن کا میں نے ذکر کیا تھا۔ میری مہمان ہیں۔" میں نے مختصراً تعارف کرایا۔

"اوہ' اچھا السلام علیکم۔ کیسے مزاج ہیں۔ پلیز' آپ بیٹھیے۔ میں بس ابھی نکل رہا ہوں۔"

"میں خود ابھی نکل رہی تھی۔ شکریہ' خدا حافظ۔" وہ سوکھے لبوں پہ زبان پھیرتی اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے بمشکل تمام بولی اور پھر تیز قدموں سے کسی کی طرف دیکھے بنا خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

"میں بھی نکل رہا ہوں یار۔ دروازہ بند کر لینا۔" دونوں کے جانے کے بعد دروازہ لاک کر کے میں ست پڑ گیا اور پھر پوری قوت سے تکیے پر مکے برساتے ہوئے اپنے وحشی جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرنے لگا۔

♥♥♥

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے
جو دیکھو تو ہر اک جانب سمندر
مگر پینے کو اِک قطرہ نہیں ہے
رات ڈھلتی نہیں......
موت مرتی نہیں......
ایک تلوار لٹکی ہوئی آسماں کے تلے......
ایک رسی ہے۔۔۔۔اور اک اس ی۔
زندگی اب کسی اور صلیبوں سے نیچے اُترتی نہیں۔
موت مرتی نہیں۔

کمپلیکس ہاسپٹل کے نیورر ولو جی ڈیپارٹمنٹکے کوریڈور میں چکر لگا لگا کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ میں بار بار تشویش ناک اور خوف زدہ نظروں سے بند کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر نیورولوجسٹ کس قسم کی ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں' اتنی دیر سے اندر گھسے ہوئے ہیں؟۔

مجھے شدید بے چینی ہو رہی تھی۔ تین دن گزر چکے تھے۔ اسی شام اس کے گھر والے اسے پمز ہاسپٹل میں ایمرجنسی میں لے آئے تھے اور تب سے وہ ادھر ہی تھی۔ میں نے کل گھر فون کیا تو پتا چلا تھا۔ شام کو میں ہاسپٹل میں پرائیویٹ کمروں کی قطار میں مطلوبہ کمرا نمبر تلاش کرتا ہوا اُس کے روبرو

پہنچا تو وہ ہوش میں تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا' رنگ زرد اور تاثرات ویران سے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہسٹریک ہو گئی۔ جوش سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر لہرا کر نیچے گر پڑی او بے ہوش ہو گئی۔ میں فوراً پلٹ آیا تھا اور آج صبح سے ہاسپٹل میں جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر اُدھر آ جا رہا تھا۔

بالآخر شام کو اس کی حالت تسلی بخش قرار دے کر اسے اس کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ میں چور قدموں سے دوازہ کھول کر کچھ جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔ اتفاق سے اس کی خالہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ تنزیلہ کی والدہ کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے والد کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے ابو بزنس کے سلسلے میں اکثر ملک سے باہر رہتے تھے۔ یہاں اپس کے پاس اپس کی بیوہ خالی ہوتی تھی جو اپنے خاوند کی وفات کے بعد مستقل تنزیلہ کے بنگلے میں رہائش پذیر ہو گئی تھی۔ سو وہی اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ میں بستر سے کچھ فاصلے پر سینے پر ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

دل دھک دھک کر رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ میں تو خود سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وہ بائیں جانب چہرہ موڑے بے حس وحرکت پڑی تھی۔ کندھوں تک سبز کمبل لپٹا ہوا تھا۔ چمکدار سیاہ بال سفید تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں کتنی ہی دیر ساکت وصامت کھڑا معذرت کے الفاظ ہو چتا رہا۔

ایسا لگ رہا تھا' جیسے تمام حرف ہو گئے ہوں۔ بالفاظ ختم ہو گئے ہوں۔ کمرے میں ایک صحرائی سکوت طاری تھا۔

بالآخر میں نے ہمت کر کے کھنکھار کر اس کو متجہ کیا۔ اس نے آہستگی سے چہرہ موڑ کر سیدھا کیا اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے جھٹکا سا لگا تھا مگر کل کے برعکس اس نے فوری ردِعمل نہیں دکھایا۔ یونہی بے جان سے انداز میں پڑی دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی سی ویرانی تھی۔

میں نے بے اختیار جھرجھری سی لی تھی۔

"کیوں آئے ہو یہاں......" بہت دیر بعد وہ بلوی تو اُس کا لہجہ نقاہت زدہ او خالی خالی سا تھا۔ ایک دم سپاٹ اور برفیلا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔ پلیز' ایک بار میری بات سن لیں۔ پھر......" میں ملتجی سا ہو کر دو قدم آگے آیا مگر اس نے سرد انداز میں میری بات کاٹ دی۔

''کچھ مت کہو۔ ایک لفظ مت کہو۔ مجھے تمہاری معذرت نہیں چاہیے۔'' بلا کا دھیما غضب ناک لہجہ تھا کہ میں دم سادھے کھڑا رہ گیا۔

''صرف ایک بار مجھے معاف کر دیجئے۔ پلیز تنزیلہ۔'' میں اُس کی شاکی نگاہوں سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ نظریں نہیں اُٹھا پا رہا تھا۔

وہ بالکل خاموش رہی۔

''یقین کیجئے۔ جو کچھ ہوا' اس میں میرے شعوری ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ پتا نہیں' مجھے کیا ہو گیا تھا۔ پَل کی بہک گیا تھا ورنہ میرے دل میں آپ کی وہی عزت ہے' ایک بہن کی طرح......''

''ایک لفظ نہ کہنا ورنہ میں تمہاری زبان کاٹ لوں گی۔'' وہ یک دم بستر سے اُٹھ کر بھوکی شیرنی کی طرح غرائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شعلے مچل رہے تھے۔ شدت غضب سے وہ شدت غضب سے وہ سر تا پا کانپ رہی تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں دم بخود سا دانتوں میں نچلا ہونٹ داب کے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے تیور اتنے جنون افزا تھے کہ میں بدحواس سا ہو گیا تھا۔

''کس لیے معافی مانگتے ہو اب...... اور میں کیوں معاف کروں تمہیں؟ معاف کرنے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ دوبارہ تعلق جوڑنے کی راہ ہموار کی جائے۔ معاف تو تب کروں' جب تم سے نئے سرے سے تعلق بنانا ہو جبکہ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم ہو کیا چیز۔ جب تک بھائی تھے' تب تک بہن بہن کی نظر سے دیکھتی تھی جو بھائیوں کی خامیاں نظر انداز کر دیا کرتی ہے' اب ایک مرد بن کر میرے سامنے آئے ہو تو سنو' میں تم جیسے لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ غیر عملی اور غیر حقیقی سوچ اور سطحی جذبات کے حامل لوگوں کو میں منہ نہیں لگایا کرتی۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا' ماسوائے خود پسندی' نفس پرستی اور خود غرضی کے۔ ایسے دل پھینک' بے حس اور بے ضمیر راہ چلتے نوجوان تو بہت مل جاتے ہیں۔'' وہ ہانپنے لگی۔

''تم اپنے کزن انتصار کو اُس کے کرتوتوں کی بدولت بڑی مکروہ اور قابل نفرت شخصیت گردانتے تھے' آ مجھے ذرا یہ بتاؤ کہ تم کتنے پانی میں ہو......'' وہ سر تا پا زہریلی ہو رہی تھی۔ آواز سے شعلے لپک رہے تھے۔

''ایک شخص کو گناہ کی خواہش ہے اور اسے قسمت سے موقع بھی حاصل ہے تو وہ بہتی گنگا میں

بخوشی ہاتھ دھو لیتا ہے۔ دوسرا شخص بھی گناہ کی خواہش رکھتا ہے مگر اسے موقع نصیب نہیں ہوتا' وہ اندر ہی اندر کڑھتا' تلملاتا رہتا ہے اور Reaction Formation کے طور پر خود کو پارسا سمجھتے ہوئے اپنی نام نہاد پرہیزگاری پر اکڑتا پھرتا ہے۔ حالانکہ یہ طے ہے کہ اسے موقع نصیب ہو جائے تو وہ بھی برابر لذت کشید کرے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے' کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہیں؟ نہیں بلکہ دونوں ایک جتنے گناہ گار ہوتے ہیں کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ یہی حال تمہارا اور تمہارے کزن انتصار کا ہے۔ اسے موقع اور اختیار حاصل ہے' وہ مزے لوٹتا ہے۔ تم اس کے مقابلے میں تقریباً قلاش اور بے ٹھکانہ ہو اس لیے محتاط رہنے پر مجبور ہو۔ ہاں موقع مل جائے تو بُرا کیا ہے۔ چاہے وہ تنزیلہ ہو' ماہرہ ہو' شبنم ہو یا...... یا...... تنزیلہ اکرام......؟

میرا سر شرم سے جھک گیا۔ اس کی طرف دیکھنے کا یارا نہ رہا تھا۔

''بلکہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو انتصار پھر بھی تم سے کچھ بہتر ہی ہو گا۔ وہ گناہ کرتا ہے تو فریب کے پردے میں نہیں کرتا یا کم از کم ''بھائی بہناپے'' کی آڑ میں مطلب براری نہیں کرتا۔ اگر وہ نباہ نہیں سکتا تو پھر رشتے داریاں بھی نہیں جوڑتا۔ بُرے شخص کی کم از کم ایک بات تو قابل تعریف ہوتی ہے کہ وہ رائی پورے خلوص سے کرتا ہے۔ جب تک عمل میں خلوص نہ ہو' عقل کی دیر کام نہیں آتی۔ خلوص کے ساتھ کسی کو دھوکا بھی دو گے تو وہ انجانے میں کھا لے گا لیکن مکاری اور فریب کاری کے ساتھ کسی سے سچا تعلق بھی جوڑنا چاہو گے تو ناکام رہو گے۔''

اس کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ میں سر جھکائے بت بنا کھڑا سن رہا تھا۔ کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔

''بس ایک بار آپ مجھے معاف کر دیں۔ یقین کریں' تین دن سے میں سولی پہ لٹکا ہوا ہوں۔ پلیز۔''

وہ کمزوری کے باعث لڑکھڑا رہی تھی۔ میں از راہ ہمدردی سہارا دینے کو آگے بڑھا مگر جونہی اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی' اس نے تڑاخ سے ایک تھپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا۔

میں گال پر ہاتھ رکھے ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

''جب تک بھائی بن کر سامنے آتے تھے تو دل و جان بھی حاضر تھے۔ اب ایک مرد کے روپ میں آئے ہو تو میں بھی اپنی فطرت کے مطابق ایک عورت بن کر تمہیں تمہاری پیش قدمی کا

جواب دوں گی۔ یہ تھپڑ ایک مرد کے ہاتھ بڑھانے کے جواب میں رسید کیا ہے۔ پہلے تمہاری "برادرانہ محبت" کا فریب بھی کھالیا مگر اب ہوش میں آ کر بے خبری کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔" اس کا لہجہ بے لچک اور انداز پتھریلے تھے۔ وہ کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھی۔

"آپ ایک بار مجھے دل سے معاف کر دیں پھر ساری زندگی آپ کو شکل نہیں دکھاؤں گا۔ میں یہ شہر ہی چھوڑ دوں گا۔"

میں نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے ٹوٹے ہوئے انداز میں کہا۔

وہ کچھ دیر کو خاموش کھڑی اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتی رہی۔

"یہی سمجھا تھا ناں، تم نے کہ دوسری لڑکیوں کی طرح تنزیلہ اکرام بھی میری خوب صورتی پر ریجھ ہوگئی ہے؟ مجھ پر مرمٹی ہے۔ میری دیوانی ہوگئی ہے۔ اسی لیے میرے ساتھ اتنی بے تکلفی برتتی ہے۔ بلا چون چرا بلاوے پہ چلی آئی ہے۔"

اُس کا چبھتا ہوا کاٹ دار لہجہ میری سماعت میں سیسہ پگھلانے لگا۔

میرے دل نے چپکے سے اس کی زیرک حس کا اعتراف کیا۔ واقعی وہ سچ کہہ رہی تھی۔ میں اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"تم دراصل شروع سے ہی کسی اچھی کمپنی سے محروم رہے ہو۔ تھرڈ کلاس اور نفس پرست لڑکیوں کے جھرمٹ میں خود کر راجہ اندر سمجھ بیٹھے تھے۔ ان کی تعریف، بھوکی نگاہوں اور معنی خیز اشاروں کو ان کی جانب سے اظہار عشق سمجھ لیتے تھے۔ تم میں ذرا سی بھی سوجھ بوجھ اور عقل و فہم ہوتی تو تمہیں بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ یہ رنگین تتلیاں تمہاری محبت میں نہیں بلکہ اپنی خواہش اور طلب پوری کرنے کی چارہ میں تمہارے جوان اور پرکشش سراپے کی سمت لپکتی ہیں۔ انہیں تمہاری ذات سے نہیں، تمہاری رس بھری کڑیل بھرپور جوانی سے غرض ہوتی ہے۔ وہ تمہیں اپنے نفس کی تسکین کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اپنی طلب سے بے چین ہو کر تم تک رسائی حاصل کرتی ہیں۔ وہ تمہیں اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہیں اور جانے کہاں کہاں سے جذبات جمع کر کے تمہیں فاتح عالم، شہزادہ سلیم، راجہ اندر اور پرنس آف ویلز کے خطابات سے نوازتی ہیں۔ یہ بات تو تمہارے لیے قابل شرم ہونی چاہیے بلکہ اسے باعث توہین سمجھنا چاہیے کہ تمہیں نفس کی ماری عورتیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ تم اُلٹا اس پر اکڑے پھرتے ہو۔ فخر سے سب کو

بتاتے ہو کہ لڑکیاں تم پر مرتی ہیں۔ معاشرے کی مہذب اور شائستہ کلچرڈ...... خواتین سے واسطہ پڑا ہوتا تو تم دیکھتے کہ اُن کی محفل میں تمہاری دو کوڑی کی عزت بھی نہ رہتی۔ شریف گھرانوں کی اعلیٰ تہذیب یافتہ خواتین ایسے بہکے بھٹکے نوجوانوں پہ نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ تم نچلے درجے کی حریص عورتوں کی محفل میں واہ واہ کروا کر خود کو فاتح عالم سمجھنے لگے۔ چہ خوب......!"

وہ لگی لپٹی رکھے بغیر بے نقط اور کھری کھری سنا رہی تھی۔ لہجے میں استہزا، طنز اور تمسخر نمایاں تھا۔

"ایک "معاشرتی عزت" ہوتی ہے اور ایک ہوتی ہے "جسمانی عزت" میں معاشرتی عزت بچانے کے لیے تم سے تنہائی میں ملنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ مجھے تم پر اندھا اعتماد تھا تھا۔ یہ تو خبر ہی نہ تھی کہ میری جسمانی عزت ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کتنا مان تھا، مجھے تم پر۔ تم سے فلیٹ میں آ کر ملنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی میرے دل میں جسمانی عزت پہ آنچ آنے کا خیال نہیں آیا تھا بلکہ میں نے اس پہلو پہ سوچنا بھی گناہ سمجھا تھا کیا خبر تھی کہ......"

وہ دل برداشتہ ہو کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے ہولے ہولے رونے لگی۔ اس کی سسکیاں نہیں تھم رہی تھیں۔

میں ندامت کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔ یہ کیا کر دیا تھا میں نے۔ وہ عورت جو عزم و استقامت اور بہادری کا سمبل سمجھی جاتی تھی، آج بے کسی کے عالم میں آنسو بہا رہی تھی۔

میں پچھلے تین دنوں سے خود کو یہ سوچ کر بہلا رہا تھا کہ بہر حال وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے پدن دکرتی ہے۔ وقتی غصہ ہے، اُتر جانے پر راضی ہو جائے گی۔ میں اسے منا لوں گا مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ معاملہ کتنا سیریس ہو چکا تھا۔ اس کے باتیں رہ رہ کر کچوکے لگا رہی تھیں۔ میں بُری طرح بے چین و مضطرب ہو گیا تھا۔

وہ مزید کہہ رہی تھی۔ لہجہ کرب سے بھیگ رہا تھا۔

"تم کیا جانو۔ میں کس اذیت سے دوچار ہوں۔ جہاں جہاں تمہارے ہاتھ لگے، مجھے اپنے وجود کا وہ حصہ ناپاک محسوس ہوتا ہے۔ ان قیامت خیز لمحوں کا تصور میرے اندر الاؤ دہکا دیتا ہے۔ وہ وقت، وہ لمحے، وہ منجمد احساسات جیسے "اسٹل" ہو کر رہ گئے ہیں میرے تخیل کے پردے پر۔ میں چاہوں بھی تو ان سے نجات نہیں پا سکتی۔ تین دنوں سے ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ سکون آور انجکشن بھی کچھ اثر نہیں دکھا رہے۔ نیم پاگل ہو چلی ہوں میں۔ ہر قوت ایک ہی اذیت بھری سوچیں

میرے وجود کر دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہیں۔" وہ ہاتھوں میں سر تھام کر بیڈ پر گر گئی۔

"حالانکہ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں جسمانی لحاظ سے محفوظ رہی ہوں۔ مگر میں خود کو برابر گناہ گار محسوس کر رہی ہوں۔ لمس کی خیانت بھی تو بہر حال خیانت ہی کہلاتی ہے۔ تم نے میرا جسم نہ سہی' میری روح تو آلودہ کر دی ہے ناں۔ میری روحانی پاکیزگی اور میری بے ساختگی کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میری معصومیت' میری سادگی کو قتل کر ڈالا ہے۔ میری روح کی شفافیت اور میرے جذبوں کی سچائی کو مجروح کیا ہے۔ لمس کی گستاخیاں جذبات کی سادگی و پاکیزگی تبھا کر ڈالتی ہیں' اسے معصوم بے خبری سے بدصورت آگاہی کی دنیا میں لے آتی ہیں۔ میں تمہیں کیسے معاف کر دوں۔ تم نے بہن بھائی کا رشتہ ہی نہیں توڑا' انسانیت کو بھی قتل کر ڈالا۔"

اس کی آواز نقاہت سے لڑکھڑانے لگی تھی اور اذیت کے مارے اُس کی آنکھیں ہورنگ ہوئی جا رہی تھیں۔

میرے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے پھر بے طرح چونک کر پلٹا اور تیزی سے ڈیوٹی کے لیے ٹک ٹک کرتی اِدھر آتی نرس کو صورت حال بتا کر باہر چلا گیا۔

♥♥♥

ناکام حسرتوں کے سوا کچھ نہیں رہا
دنیا میں اب دکھوں کے سوا کچھ نہیں
اِک عمر ہوگئی ہے کہ دل کی کتاب میں
کچھ خشک پتیوں کے سوا کچھ نہیں رہا
جذبے تمام سو گئے لمحوں کی دھول میں
اب دل میں دھڑکنوں کے سوا کچھ نہیں رہا

"دنیا میں اب دُکھوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔" فٹ پاتھ پر پڑے پتھر کو پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے میں نے بے اختیار یہ مصرعہ ذہن میں دہرایا تھا۔ پتھر نے بطورِ احتجاج پھٹے ہوئے جوتے سے جھانکتی دوسری انگلی پہ شدت سے ضرب لگائی' میں بے اختیار "سی" کر کے جھک کر پاؤں مسلنے لگا۔

آوارہ گردی کرتے کرتے جب تھک گیا پرندے کی طرح اپنے ٹھکانے پہ واپس لوٹ آیا۔

حق نواز شاہ سالن بنا رہا تھا۔

"آج تمہاری' اُن کا' فون آیا تھا میرے آفس میں..... کیا نام ہے۔ ہاں' مس تنزیلہ اکرام۔ تمہارا پوچھ رہی تھیں۔" وہ مصروفیت کے عالم میں بولا۔

"کیا۔" مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اعصاب پر جیسے ایٹم بم کا دھماکا ہوا تھا۔ آج ایک ماہ بعد اسے کیسے خیال آ گیا اور پھر حق نواز شاہ کو کہاں سے ٹریس کیا ہوگا۔ کیا میرے لیے؟

”ہاں‘ تمہاری جاب اور تمہاری......ایکٹیوٹیز کے متعلق دریافت کر رہی تھیں۔ میں نے بلا کم و کاست کہہ سنایا کہ تم ابھی تک اپنے مطلب کی جاب حاصلکر نے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ گھر نہیں گئے‘ ابھی میرے پاس ہی ہو اور یہ کہ ضد کر کے شراب منگواتے ہو اور غٹاغٹ چڑھا جاتے ہو۔ سگریٹ بھی پینی شروع کر دی ہے۔ دن بھر آوارہ پھرتے ہو۔ یہ بھی بتایا دیا کہ کچھ عرصے بعد بے ٹھکانہ بھی ہو جاؤ گے۔ میری شادی طے ہو گئی ہے اور شادی کے بعد میری منجلی میرے ساتھ رہائش پذیر ہو گی۔“

وہ کھرا بندہ تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تھا۔ اس نے سادگی سے سب بتا دیا۔

”اس نے تمہارے لیے پیغام دیا ہے کہ تم کل اُس سے فون پہ رابطہ کرو۔“

”مگر کیوں“ میں خود سے اُلجھنے لگا۔

آج پورے ایک ماہ بعد کیسے میری یاد آ گی۔ میں اس دن کے بعد اُس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ دل جیسے ایک دم ٹھٹھر سا گیا تھا۔ اگلے روز میں مخمصے میں پڑا رہا۔

”فون کروں یا نہ کروں......؟

پھر بیزاری کے عالم میں نے یونہی گھر بیٹھے بیٹھے دن بتا دیا۔ یوں لگ رہا تھا‘ جیسے دل کی اُمنگ ختم ہو گئی ہو۔ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں بھی کچھ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جو ہو سو ہو۔ طبیعت پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

اس جمود کو تین دن بعد تنزیلہ اکرام کی طرف سے بھیجی گئی رجسٹری نے ایک چھناکے سے توڑ ڈالا۔ رجسٹری حق نواز شاہ کے فلیٹ کے ایڈریس پر آئی تھی اور میرے نام تھی۔ میں نے بے دلی سے خاکی لفافہ چاک کیا۔

سفید چکنے کاغذ پر موتیوں کے سے حروف میں لکھا تھا۔

”تحریم اختر! السلام علیکم!

ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ میں نے بھی دوسروں کی طرح یہ سوچ کر کہ ” مجھے کیا‘ خود ہی اپنی زندگی تباہ کرے گا“ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا ہوتا مگر پھر

میں نے سوچا اگر ہر شخص کسی کو بھٹکتا دیکھ کر یہی طرزِ عمل اپنانے لگا تو پھر کون رہنمائی کرے گا۔ کون بھولے ہوؤں کو راستہ بتائے گا۔ اس طرح تو آہستہ آہستہ پورا معاشرہ بے حسی اور بے ضمیری کی سیاہ رد میں اَٹ جائیگا۔ نیکی زندہ نہیں رہے گی اور انسانیت کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا انسانیت تو دوسروں سے ہمدردی کرنے اور کل عام کی بھلائی چاہنے کا نام ہے۔ تم اب میرے نہیں تو کسی کے تو بھائی ہو‘ کسی کے بیٹے ہو‘ پھر سب سے بڑھ کر اس ملک کے‘ اس معاشرے کے فرد‘ نوجوان ہی تو بزرگوں کی ذمّے داریاں سنبھالتے ہیں۔ اپنے ملک وقوم کے لیے مثبت تعمیری کام کر کے اس کی ترقی من ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اگر ہمارے معاشرے کے نوجوان محروم اور ناآسودہ ہو کر اسمگر‘ چور‘ ڈاکو‘ شرابی‘ نشہ باز یا عزتوں کے لٹیرے بن جائیں گے تو پھر تو اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہو گا۔

”تحریم۔ تم سے ایک بھائی اور ایک ”انسان“ ہونے کے ناطے دُہرا تعلق بنایا تھا مگر افسوس تم نے کسی ایک کا بھی مان نہ رکھا۔ نہ بھائی رہے اور نہ انسان۔ پہلا تعلق تو دوبارہ نہیں جڑ سکتا کہ فطری بے ساختگی قائم نہیں رہ سکتی۔ آئینے میں بال آ چکا ہے لیکن اگر تم خلوص دل سے اپنے اندر نئے سرے سے ”انسان“ کے عظیم مرتبے تک پہنچنے کی ضروری شرائط پوری کرنے کی استقامت پیدا کر کے انسانیت کو دوبارہ زندہ کر لو اور پوری ایمانداری اور سچائی سے اس کے بنیادی عناصر کو خود میں جذب کر لو تو میں فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہر کرتے ہوئے بحیثیت ایک انسان کے انسانیت اور انسادوستی کے ناطے تمہارا موقف سننے کو تیار رہوں۔ تم چاہو تو مجھے گھر پر فون کر کے اپنا فیصلہ سنا سکتے ہو کہ آیا تم انسانیت کے ناطے قائم کیے گئے تعلق کی ازسرِنو ”تجدید“ کرنے کی اہلیت رکھتے ہو یا نہیں؟ یاد رکھو اپنی محرومیوں کا بدلہ خود سے اور دوسرے سے لینے کے لیے اپنے نفس کو بے لگام کرنے والے لوگ اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ جن لوؤں سے ہمیں تکلیف پہنچی ہو‘ دل بڑا کر کے ان کو معاف

کر دینا اور ان کے دیے ہوئے زخموں کو عظمت حاصل نہیں کرو گے؟ اپنے ذہن سے انتصار صاحب' اپنے والدین اور تنزیلہ کے باپ سے متعلق متعمانہ سوچوں کا یہیں دفن کر دو اور پوری ایمان داری اور استقامت سے اپنی تعلیم اور ملازمت کے لیے خود کو وقف کر دو۔ مجھ سے رابطہ کرو گے تو تمہاری جاب اور رہائش کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

خیر اندیش' تنزیلہ اکرام!"

❤❤❤

"یہ بختیار احمد ہیں۔ میرے اور اظہار کے بڑے اچھے شناسا رہے ہیں۔" ٹاپ مین شوز" کے ہاں سیلز مینجر ہیں اور اس کے علاوہ پرافٹ کے ساتھ اپنی شاپ کے لیے مال خرید کر اسٹاک کرنے کا شعبہ بھی یہی ڈیل کرتے ہیں۔ اُن کے ہان سیلز مین کے لیے آج کل اسامی خالی ہے۔ یہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کریں گے' اس کے علاوہ رہائش کا مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے تین دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک پورشن کرائے پر لے رکھا ہے۔ تم بھی اپنے حصے کا کرایہ ڈال کر ان کے ہمراہ شیئر کر سکتے ہو۔ انہوں نے مالک مکان سے بات کر لی ہے' اسے اس اضافے پر کچھ اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ مجھے گٹھے ہوئے بدن کے دراز قامت بختیار احمد سے ملواتے ہوئے ساری تفصیل بتا رہی تھی۔

"فی الحال شاید میں افورڈ نہ کر سکوں" میں نے نظر جھکا کر آہستگی سے کہا۔

"پہلے دو ماہ کا ایڈوانس کرایہ میری طرف سے ادا ہو جائے گا۔" اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بختیار احمد سے گفتگو جاری رکھی۔

"اچھا بختیار صاحب پھر آپ اپنی شاپ کے مالک سے بات کر لیجیے گا کہ لڑکا کل سے ملازمت پر آ جائے گا۔"

"آپ بے فکر رہیے۔ آپ نے کہہ دیا تو سمجھیں کہ ہو گیا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔" وہ گرم جوش سے کہہ کر رخصت ہو گیا۔

کتنی ہی دیر کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نظر چرا رہے تھے۔

''میں یہ جاب شاید نہ کر سکوں۔'' بالآخر میں جھکی جھکی نظروں سے اپنے ناخن دیکھتا ہوا بولا ''اور رہائش کے لیے بھی جگہ نامناسب ہے۔ چار لوگ وہ ہیں' پانچواں میں۔ ایک پورشن میں زیادہ زیادہ ایک ڈرئنگ روم' ایک بیڈروم اور کچن ہوگا۔ میں شاید وہاں نہ رہ پاؤں۔ مجھے بند جگہوں پر گھٹن ہوتی ہے۔'' وہ سر اُٹھا کر بغور میری طرف دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب استہزائیہ سی برفیلی کیفیت رقم تھی۔

''میرا خیال ہے' تم پرائم منسٹر ہاؤس میں درخواست دے دو کہ وہ ازراہ عنایت کرسی خالی کر دیں۔ تمہارے لیے وہ عہدہ زیادہ مناسب رہے گ۔''

اس کے جذبات سے عاری روکھے لہجے میں طنز کی جھنکار تھی۔

میں خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگا۔

''اتنے نازونعم سے رہنے کی چاہ تھی تو گھر کا پرآسائش ماحول چھوڑا ہی کیوں تھا؟ کیوں دربدر ہوئے؟ خود کو برباد کیا......؟

''آپ سے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ہو لینے دیجیے' مجھے برباد۔ کیوں پروا کرتی ہیں میری۔ میری زندگی کو کس کو ضرورت ہے۔ کس کے لیے بچاؤں' سنبھالوں' سنواروں۔ یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناں کہ میں یوہی دربدر بھٹکتا ہوا تباہی کے رستے پہ اُتر جاؤں گا اور ایک روز موت سے گلے جا ملوں گا پھر کیا ہو جائے گا! بہت سے لوبرباد ہوتے ہیں' مرتے ہیں ایک میں بھی سہی۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ خوش رہیں۔ بس مجھے معاف کر دیں' ایک بار۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو دوبارہ شکل نہیں دکھاؤں گا سو پورے مہینے دوبارہ آپ کے سامنے نہیں بڑھا۔ آج بھی آپ کے خط کے جواب میں آپ کے بلاوے پر آیا ہوں۔ مجھے آپ سے کسی شے کی طلب نہیں۔ آپ کی بہت مہربانی' آپ نے میرا اتنا خیال کیا۔ میرے لیے جاب اور رہائش کا بندوبست کیا۔ مجھے آپ سے فقط اتنا کہنا ہے کی آپ واقعی اندر باہر سے کھری ہیں۔ آپ بہت مخلص اور بے غرض ہیں مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ شاید میرے من میں کوئی کھوٹ ہے۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔ آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ کا مجھ جیسے نفس پرست شخص سے کیا جوڑ بنتا ہے۔ صرف ایک بار مجھے معافی دے دیں۔''

میں شدت جذبات سے سرخ چہرہ لیے اضطراری کیفیت میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عجب احساس بے مائیگی' ذلت اور بے بسی کی سی کیفیت تھی زندگی کس موڑ پر لے آئی تھی مجھے۔

''بیٹھو۔'' میں عالم جنون میں رخصت ہونے کو تھا' جب اس نے طویل خاموشی کا وہ سکوت کو توڑا۔ میں اس کیا انداز سے کچھ اخذ نہیں کر سکا تاہم چپ چاپ اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

وہ مضطرب سے انداز میں ٹیبل پر دھرا پیپر ویٹ گھما رہی تھی۔ شاید بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

''تمہارے بھڑک اُٹھنے کا سبب میں جانتی ہوں مگر تم غالباً ایک بات بھول رہے ہو۔ تعلق کی فطری بے ساختگی ایک بار مضروب ہو جائے تو پھر لوٹ کر نہیں آیا کرتی۔ تم مجھ سے اسی پرانے اپنائیت بھرے' نرم و متبسم' نخرے اُٹھانے والے رویوں کے طالب ہو۔ جو سب انداز ایک بھائی کے لئے تھے اور اب میرا بھائی ''قتل'' ہو چکا ہے۔ ایک ماہ پہلے اپنے ہاتھوں حق نواز شاہ کے فلیٹ میں اُس کا جنازہ اُٹھایا تھا۔ اب صرف تحریم اختر نامی ایک مرد باقی رہ گیا ہے جو ابھی ''انسان'' کہلانے کی حدود میں نہیں ہوا۔ میں انسانی ہمدردی کے ناطے زیادہ سے زیادہ جو کچھ تمہارے لیے کر سکتی ہوں' وہی کیا ہے۔ میرے لہجے کی اجنبیت اور انداز کی بے گانگی کا گلہ نہ کرو کہ یہ تمہارے ہی بکھیے ہوئے ہیں۔ میں کس دل سے اور کس لحاظ سے تم سے سابقہ والہانہ اور بے ساختہ انداز میں پیش آؤ! تم نے چھوڑا ہی کیا ہے باقی۔ مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں کوشش کے باوجود تم سے اپنائیت اور یگانگت سے بات نہیں کر سکتی۔ وہ انداز واپس نہیں لے سکتی۔''

اس کا لہجہ سپاٹ اور بے تاثر تھا۔

احساس جرم مجھے سانپ کی طرح ڈنگ مارنے لگا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اس نے گہری سانس لے کر دوبارہ گفتگو کا سلسلہ نکلا کیا۔

''بہر حال۔ ماضی کو دفنا کر حال کی طرف لوٹتے ہیں۔ سود و زیاں کے حساب سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میرے پیش نظر صرف اور صرف تمہارا مستقبل اور تمہاری کامیاب زندگی ہے۔''

''آپ نے وہ نظم پڑھی تھی۔'' معاً میں نے دھیرے سے پوچھ لیا۔

''اسی کے جواب میں تو خط بھیجا تھا تمہیں۔'' وہ اضطراری انداز میں قلم ہاتھ میں گھما رہی تھی۔

ایک ماہ پہلے جب کمپلیکس ہاسپٹل میں اُس سے بات ہوئی تھی تو واپس آتے ہوئے میں چپکے سے ایک سفید کاغذ اس کے تکیے سے نیچے رکھ آیا تھا۔ اس کاغذ پر بغیر کسی القاب یا اختتام کے صرف ایک نظم تحریر تھی۔ نظم میں کیا تھا گویا اپنے اندر سرسراتے جذبات کے جھکڑوں کی وجوہات درج تھیں۔ یہ نظم نوشی گیلانی کی تھی۔

ہوا کو آوارہ کہنے والو
کبھی تو سوچو، کبھی تو لکھو
ہوائیں کیوں اپنی منزلوں سے بھٹک گئی ہیں
نہ اُن کی آنکھوں میں خواب کوئی
نہ خواب میں انتظار کوئی
نہ اُن کے سارے سفر میں صبحِ یقین کوئی
نہ شام اور اعتبار کوئی
نہ اُن کی اپنی زمین کوئی
نہ آسمان پر کوئی ستارہ
نہ کوئی موسم نہ کوئی خوشبو کا استعارہ
نہ روشنی کی لکیر کوئی
نہ اُن کے دکھ پر کتاب لکھے
مسافرت کے عذاب لکھے
ہوا کو آوارہ کہنے والو
کبھی تو سوچو......

بہت معنی خیز نظم تھی۔ میں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا اور غالباً ایک ماہ اس کو مدِنظر رکھ کر بالآخر وہ فیصلہ کن نتیجے پر پہنچی تھی۔

"تحریم۔ فی الحال تمہیں موجودہ حالات سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ دیکھو! وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی ترجیحات اور خواہشات میں بھی تبدیلی لانا پڑتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے ماضی میں بہت عیش و آرام میں زندگی بسر کی مگر اب موجودہ صورت حال میں تم اس کے متحمل نہیں

ہو سکتے۔ ماضی کی تن آسانیاں بھول جاؤ۔ میدانِ عمل میں کودے ہو تو پورے ولولے اور سرفروشی سے آگے بڑھو۔ میرا خیال ہے کہ رہنے کے لیے فی الحال بختیار صاحب کے پورشن کے علاوہ اور کوئی اچھی جگہ نہیں ملے گی۔ ہاں' سیلز مین کی جاب سے میں بھی غیر مطمئن ہوں۔ تم دو تین ماہ خرچہ پانی چلاؤ۔ میں اس دوران کوئی بہتر جاب تلاش کرتی ہوں۔ فی الحال تو یہی غنیمت ہے۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ تو ہونا بہتر ہے۔ تمہارا سب سے اولین کام ہے' دل لگا کر بی اے کی تیاری کرنا۔ نوکریاں بدلنے کی بجائے پورا دھیان اپنی تعلیم کی طرف دو۔ مجھے تمہارے برسرِ روزگار ہو جانے سے زیادہ تمہارے تعلیم یافتہ ہونے پر خوشی اور اطمینان ہوگا۔ تعلیم مناسب ہوگی تو جاب بھی اچھی ملے گی۔"

پھر وہ کتنی ہی دیر مجھے سمجھاتی رہی۔ انداز میں پہلے جیسی شگفتگی' تبسم ریزی اور بشاشت تو نہ تھی مگر بہر حال 'خیال رکھنے' سمجھانے اور بتانے کے انداز میں وہی خلوص' وہی لگن اور دوستانہ پن تھا۔

"یاد رکھنا تحریم۔ انسانیت کے ناطے قائم کیے گئے قائم کیے گئے اس تعلق کی حرمت پہ آنچ آئی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا" میں نے جی جان سے یقین دلایا۔

"میرے لیے آپ پہلے بھی محترم و مکرم اور مقدس تھیں اور اب بھی میرے دل میں آپ کا مقام بہنوں کی طرح......"

نام مت لو اس رشتے کا۔" اس نے بھڑک کر میری بات کاٹ دی۔

"نفرت ہو گئی ہے' مجھے اس رشتے سے۔ کوئی کسی کا بھائی یا بہن نہیں ہوتا۔ تم نے مجھے یہی شعور بخشا ہے کہ واقعی رشتہ وہی ہوتا ہے خون کی بنیاد پر قائم ہو۔ سگا سگا ہی ہوتا ہے اور محض کہہ دینے سے کوئی کسی کا بھائی نہیں بن جاتا۔ میں اب زندگی میں کسی سے ایسا رشتہ قائم نہیں کروں گی۔ ایک ہی سے عبرت حاصل ہو گئی ہے...... اور ہاں۔ تم نے اپنی نفس پرستی کے مظاہرے سے خود کو بے اعتبار کر لیا ہے۔ اپنا اعتبار بحال کرنا اب تمہارا کام ہے۔ تمہارے رویے ہی تم سے مزید تعلقات استوار کرنے کے ضمن میں ذمے دار ٹھہرائے جائیں گے۔"

♥♥♥

"ارے' آپ بختیار احمد۔" ایک فربہ اندام کی گوری سی خاتون پانی بچی کے لیے جوگرز پسند کرتی ہوئی معاً بختیار صاحب کی لپکی تھی۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی جناح سپر مارکیٹ کھلی تھی اور اس میں واقع "ٹاپ مین شوز" والوں نے بھی کچھ دیر پہلے ہی شٹر اُٹھائے تھے۔ رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے خاتون کی بے یقین سی مسرت بھری چہکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

بختیار احمد بھی خوش دلی سے اُس سے ملے۔

"نغمہ عثمان۔ جی جناب' پہچان لیا۔ آپ میرے ہی ڈیپارٹمنٹ میں ہوا کرتی تھی۔ اکنامکس میں ماسٹرز کے پہلے سال میں تھیں' جب اپنے شوہر عثمان صاحب کو پیاری ہو گئیں۔"

"بہت خوب۔ تو گویا سب یاد ہے اور کیا کر رہے ہیں آج کل؟"

وہ لوگ حال احوال پوچھنے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگ گئے۔

"گروپ کے باقی لوگوں سے کبھی ملاقات ہوئی۔ یہ اظہار اور تنزیلہ لوگ کہاں ہوتے ہیں آج کل......؟"

"اظہار تو پانچ چھ برس پہلے جرمنی چلا گیا تھا۔ مستقل وہیں رہائش اختیار کر لی ہے۔ کبھی کبھار بھولے بھٹکے سے سال چھ مہینے بعد فون پہ بات ہو جاتی ہے اور تنزیلہ جی کی تو آپ کو خبر ہی ہو گئی' ماسٹرز کے فوراً بعد "اسٹار کو کمپنی" جوائن کر لی تھی۔ سو وہیں ہوتی ہیں وہ۔"

تنزیلہ اور اسٹار کمپنی کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کی باتوں پر دھیان دینے پر مجبور ہو گیا۔

"یہ وہی اسٹار کو کمپنی ہے ناں' جہاں اظہار کے بڑے بھائی ایڈمن انچارج کے طور پر کام کرتے ہیں۔"

"ہاں' تنزیلہ اسی کے توسط سے کمپنی میں متعارف ہوئی تھی۔ کچھ عرصے اظہار نے بھی اسٹار کو کمپنی میں کام کیا تھا پھر اکتا کر چھوڑ دیا اور چانس ملنے پر جرمنی چلا گیا۔ پیسہ کمانے۔" بختیار صاحب آخر میں ہنس دیے۔

اُن کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ انتصار بھائی سے چھوٹے اظہار بھائی ایک زمانے میں تنزیلہ اکرام کے کلاس فیلو اور قریبی شناسا رہ چکے تھے۔ یہ انکشاف کم از کم میرے لیے خاصا حیران کن تھا۔ تنزیلہ نے کبھی بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔

میں اگلی بار "بلیک بیئرڈ" میں تنزیلہ سے ملا تو یونہی باتوں باتوں میں چھیڑ بیٹھا۔ ہم مہینے میں دو تین مرتبہ حال احوال جاننے کے لیے ایک دوسرے سے جناح سپر کے کسی ریسٹورنٹ میں مل لیتے تھے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا اس لیے تنزیلہ مجبوراً "سیمز برگر" "تاج محل" یا "بلیک بیئرڈ" میں بلوا لیتی تھی۔ یہ جناح سپر کے معروف ریسٹورنٹ تھے۔ اس طرح میرے کام کوج کا حرج بھی نہیں ہوتا تھا۔ بختیار صاحب ایک آدھ گھنٹے کی بخوشی رخصت دے دیتے تھے پھر دو قدم پر ہی تو جانا ہوتا تھا۔ وہ ملاقات کے آغاز میں سب سے پہلے میری تعلیمی کارکردگی کی رپورٹ طلب کرتی تھی۔ میں نے بی اے کا کافی کورس کر لیا تھا۔ اس کی سخت ترین تنبیہ اور ہدایت کے پیشِ نظر اپنے ذہن کو صرف اور صرف پڑھائی میں مشغول رکھتا تھا۔ اس کی شدید ترین خواہش تھی کہ میں اسی سال بی۔ اے کے امتحان میں بیٹھ جاؤں۔ میں نے خاصی تیاری کر لی تھی کہ اب میں اُس کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"ہاں۔ ہم لوگ کلاس فیلو رہے ہیں ایک دوسرے کے۔" اس نے مختصراً کہا پھر حسب سابق اپنی ذات کو موضوع گفتگو بنتے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح موضوع بدل دیا۔

۱۰ جنوری سے داخلے بھیجے جا رہے ہیں بی۔ اے کے۔ یعنی بمشکل بیس دن رہ گئے ہیں۔ تم فوراً سے پیشتر آج کل میں داخلہ فیس اور کاغذات جمع کرا دو۔ یا ایسا کرو' کاغذات مکمل کر کے مجھے دے دو۔ میں ایک دو روز میں جمع کروا دیتی ہوں۔ یہ داخلہ فارم تو میں لے آئی ہوں۔"

اُس نے فارم میرے حوالے کر دیا۔ اسے ہمیشہ میری تعلیم کے بارے میں فکریں رہتی

تھیں۔

اسے کنی کتراتا دیکھ کر میں نے بھی اپنا تجسس دباتے ہوئے دوبارہ بات نہ کی۔ البتہ کتنے دنوں تک مخمصے میں پڑا رہا۔

''آخر کیا تعلق بنتا ہے اس مثلث کے بیچ؟''

اظہار...... انتصار اور تنزیلہ اکرام۔

تینوں میں کیا رشتہ ہے۔ اس کی کیا نوعیت ہے۔ جس کے باعث وہ اس موضوع پر بات کرنے سے خائف رہتی ہے۔

پھر بی۔اے کے امتحانات شروع ہو گئے اور تنزیلہ نے بختیار صاحب سے شفارش کروا کے مجھے ایک ماہ کی رخصت دلوادی۔ میں تندہی سے پرچوں کی تیاری میں جت گیا۔ خدا خدا کر کے پیپرز ختم ہوئے تو تنزیلہ کے پاس ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔

ایک کمپنی میں کمپیوٹر پروگرامنگ کے شعبے میں ویکنسی خالی ہوئی تھی۔ تنزیلہ کی دوڑ بھاگ اور کچھ میری خوش قسمتی کے سبب بالآخر یہ جاب مجھے مل گئی۔ اب مجھے صحیح معنوں میں سکون نصیب ہو گیا۔ واقعی ایسی جاب کو شایان شان کہا جا سکتا تھا۔ بہت زیادہ نہیں تو کافی حد تک مناسب اور ''قابل عزت'' تو تھی ناں۔ سیلز مین شپ میں تو بندہ خواہ مخواہ خود سے شرمندہ رہتا ہے۔ آنے جانے والے شناسا چہروں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرنا بھی کوئی جاب ہوا کرتی ہے۔!

آخر ایک دن میں نے اُس سے اگلوا ہی لیا۔

♥♥♥

اس وقت ہم لوگ ''سیمز برگر'' کی سیڑھیاں طے کرنے کو تھے جب اچانک تنزیلہ کی نظر پارکنگ لاٹ پر رکتی گاڑی پر پڑی۔

''ارے یہ تو مسز ہاشمی ہیں۔ ہماری پڑوسن۔ تم ایسا کرو' اندر جا کر آرڈر دو' میں ان سے سلام دعا کر کے آتی ہوں۔'' وہ مجھے اپنا بیگ پکڑا کر بعجلت پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھی تھی۔

میں کندھے اُچکا کر سیڑھیاں طے کرتا ہوا سیمز برگر میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کے پاس جا کر مینو پڑھتے ہوئے کتنی ہی دیر انتخاب کرنے میں لگ گئی۔

پچھلے دنوں تنزیلہ کی ترقی ہوئی تھی۔ میں نے مبارک باد دیتے ہوئے ٹریٹ مانگی اور وہ رضا مند ہو گئی۔ آج طے شدہ پروگرام کے تحت ہم یہاں موجود تھے۔

سیمز برگر میں پے منٹ کر کے آرڈر دینا ہوتا ہے اسی لیے اُس نے اپنا بیگ تھمایا تھا۔ بیگ میں والٹ ڈھونڈتے ہوئے میں نے بے دھیانی میں کچھ چیزیں نیچے گرا دی تھیں۔ ادائیگی کے بعد سیٹ کی جانب پلٹتے ہوئے میں نے جھک کر بیگ سے گری چیزیں سمیٹیں اور پھر سرخ نرم چمڑے کی آرام دہ نشست پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے اُنہیں بیگ میں ڈالنے لگا۔ اچانک بیگ میں کی اندرونی جیب میں مجھے دو تین فوٹو نظر آئے۔ یونہی تجسس دور کرنے کے لیے نکال کر دیکھا اور پھر مجھے یوں لگا' جیسے ریسٹورنٹ کی پوری عمارت کا ملبہ میرے اوپر آ گرا ہو۔

میرے اعصابی نظام کے برخچے اُڑنے لگے تھے۔ اپنی بینائی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''جی ہاں۔ انتخاب ہو گیا......؟'' معاً وہ میرے مقابل کی سیٹ پر براجمان ہو گئی تھی۔

میں نے سلگتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ نہ جانے کیا ہوا تھا۔ کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ان تصاویر میں اُس کی کسی کے ساتھ دیکھ کر میری آنکھوں میں لہو اُتر آیا تھا۔

"پہلے یہ "انتخاب" تو دیکھ لیں۔" میں نے بلا کے زہریلے لہجے میں کہتے ہوئے تصویریں اُس کے سامنے پھینک دیں جنہیں دیکھتے ہی اُس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ نگاہ کترا کر تیز تیز پلکیں جھپکاتی ہوئی کاؤنٹر کی سمت دیکھنے لگی۔

"کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گی؟" میرے لہجے میں تمسخر، تحقیر اور استہزا سبھی کچھ تھا۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون جیسے انگاروں میں بدل گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ "نظارے" مجھ سے برداشت نہ ہو سکے تھے۔ میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"تم نے کیا اخذ کیا ہے ان سے؟" کچھ توقف کے بعد وہ خود پر قابو پا کر نہایت سکون سے میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"جو صاف نظر آ رہا ہے؟" میں نے دہکتے ہوئے کہا۔ اُس نے گہری سانس لی اور بے تاثر انداز میں سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

"میں نے پہلے بھی کسی زمانے میں تم سے کہا تھا کہ ضروری نہیں ہے کہ آنکھ کی گواہی سچی ہو۔ جو نظر آتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے اور جو کچھ ہم ہوتے ہیں، ویسے نظر نہیں آتے۔" وہ کچھ فاصلے پر رکھے پیڈ اسٹل پنکھے کے پروں کی حرکت پر نظر جمائے ہوئے سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ سب سے مختلف اور منفرد اور میں نے جھٹلاتے ہوئے بارہا تمہیں جتایا تھا کہ میں کوئی پراسرار چیز نہیں ہوں، عام سی لڑکی ہوں۔ عام سے خیالات اور جذبات واحساسات کی مالک مگر تم ایسا سمجھنے سے انکاری تھے۔ تحریم......"

اچانک اس نے سر اٹھایا اور دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے پیالے میں سجاتے ہوئے سنجیدگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کا چہرے پر عجیب وغریب تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔

"انسان اندر سے ایک ہی ہوتا ہے۔ محبت، نفرت، انتقام، پیار، ہمدردی، جنون، غصہ یہ سب انسانی رویے ہیں اور سب میں موجود ہوتے ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں۔ ہم سب انہی جذبات واحساسات کے مالک ہیں۔ ہاں مگر اصل چیز ہے ان کا تناسب۔ اگر یہ تناسب بگڑ جائے

تو انسان کا کردار بھی بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے اور اگر اس تناسب میں توازن رہے تو ہر بگاڑ، ہر انتشار خود بخود سنورتا چلا جاتا ہے۔ کسی مین کسی ایک جذبے کی شدت ہوتی ہے اور کسی میں کسی دوسرے جذبے کی فراوانی یا کمی ہوتی ہے۔ یہ زیادتی یا قلت ایک مخصوص حد پار کر جائے تو ایسے رویے غیر انسانی رویوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بس یہی زندگی کے سارے کھیل کی بنیاد ہے۔ ایک بات بتاؤں! انسان ماں کے پیٹ سے عالم فاضل پیدا نہیں ہوتا۔ سب معصوم ہوتے ہیں، سیدھے ہوتے ہیں، بے وقوف ہوتے ہیں۔ ماحول اور تجربات ہی سبق سکاتے ہیں۔ ٹھوکریں کھا کر سب سنبھلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب سنبھل جاتے ہیں تو یوں نیک بن بیٹھتے ہیں، جیسے کبھی کوئی حماقت، کوئی غلطی کی ہی نہ ہو۔ پیدائش سے ہی باشعور، سمجھدار اور عقل مند پیدا ہوئے ہوں۔ ابتدا میں سب ہی لڑکھڑاتے ہیں پھر لڑکھڑا کر ڈگمگا کر سنبھلتے اور سدھر جاتے ہیں۔ سنو! میں نے یہ فہم وفراست اپنے تجربے اور مشاہدے سے سیکھی ہے۔ ایک زمانے میں، میں بھی بہت بے وقوف، بھولی بھالی اور سیدھی سادی ہوا کرتی تھی۔" وہ جیسے کھو سی گئی تھی۔

میں دم بخود بیٹھا اُس کے بولنے کا منتظر تھا۔ انکشاف کی گھڑی بالآخر آ گئی تھی۔ میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں دوبارہ ان تصاویر کو دیکھا۔ ایک میں تنزیلہ انتصار بھائی کی گری میں فرنٹ سیٹ پر اپن کے ہمراہ بیٹھی ہنستے ہوئے اُن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی ایک گیٹ کے اگے رکی تھی اور عمارت کی پیشانی پر للکھا نام واضح تھا۔

یہ ایک ایسا گیسٹ ہاؤس تھا جو کہ در پردہ بدکاری کا اڈہ تھا۔ بڑے بڑے اثر رسوخ رکھنے والے لوگ اپنے ہمراہ لڑکیوں کو لے کر یہاں کچھ گھنٹوں کے۔ لیے کمرا کرائے پر لے کر داد عیش دیتے تھے۔

دوسری تصویر ایک بیڈ روم ٹائپ کمرے کی تھی۔ یہاں دو بیڈ، ایک کرسی اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ تنزیلہ بیڈ کے کنارے پر بڑے خوشگوار انداز میں بیٹھی ہوئی تھی، جبکہ انتصار بھائی کوٹ اُتار کر ہاتھوں میں لیے مسکراتے ہوئے اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ یہ سین اس گیسٹ کے بیڈ روم کا تھا کیونکہ بیڈ کی سائیڈ پر پڑی پلیٹ پر اس گیسٹ ہاؤس کا مخصوص مونوگرام واضح نظر آ رہا تھا۔

"ان تصاویر سے تو اندازہ ہو رہا ہے کہ کسی زمانے میں آپ کے انتصار بھائی سے "گہرے" مراسم رہے ہیں۔" میرا طنزیہ انداز خود بخود معنی خیز بن گیا تھا۔

"تو کیا وہ 'فاتح اعظم' انتصار بھائی ہیں جنہوں نے آپ کے دل پہ کمند ڈالی اور اسے فتح کیا۔" میں نے کٹیلی نگاہ ڈال کر سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

وہ عجیب ملول سے انداز میں مسکرادی۔

"مجھے یوں لگتا ہے تحریم! جیسے میرے دل کا قلعہ کوئی بھی فتح نہیں کر سکے گا کہ یہ اندر سے بہت سنسان اور تاریک ہے۔"

میں ذہنی طور پر اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ اُس کے جملے کی ساخت اور تاثر پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ میں بے صبری سے اس کی شخصیت کے اسرار جاننے کا خواہاں تھا۔

"بتایئے ناں۔"

"کیا بتاؤں"؟ وہ گہری سانس لے کر چھت کی سمت دیکھنے لگی۔ "بہت چھوٹی سی ادھوری سی داستان ہے۔ میں اور اظہار یونیورسٹی فیلو تھے۔ اُس کے منہ سے اسٹار کو کمپنی کا نام سن رکھا تھا۔ غائبانہ اس کے بھائی سے بھی متعارف تھی مگر صرف نام کی حد تک۔ ایم اے کے بعد میں نے کمپنی جوائن کی تو شروع شروع میں مجھے ایڈمن ڈیپارٹمنٹ میں انتصار صاحب کے انڈر کام کرنے کا آرڈر ملا۔ میرے دل میں اظہار کے بڑے بھائی ہونے کے ناطے اُن کے لیے احترام کا جذبہ تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے تھے پھر میں نے اڑتی اڑتی خبریں اُن کے خلاف سنیں۔ میں محتاط ہوگئی۔ ان سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ ایک دن وہ بڑے سنجیدہ موڈ میں میرے پاس آئے۔ مجھے اپنی زندگی کی اسٹرگل' اپنا بیک گراؤنڈ' اپنے گھریلو مسائل' موجودہ معاملات سب ڈسکس کیے اور پھر بڑے مخلصانہ انداز میں مجھے اپنی ذہنی مسائل اور احساس تنہائی دور کرنے کے لیے دوستی کی آفر کی۔ میں اس وقت جذباتی قسم کی ہمدردی اور عالمگیر انسانیت کی دعوے دار تھی۔ ابھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جہاں دیدہ نہیں تھی۔ میں نے مکاری اور فریب کا اصل چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دگنے خلوص سے اُن سے دوستی کے آداب نبھائے۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں' اپنے احساسات' اپنے مسائل بتاتے تھے۔ چونکہ کام بھی ایک ساتھ کرتے تھے اس لیے کافی انڈراسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔ اظہار اکثر اسٹار کو کمپنی میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ مجھ سے ہائے ہیلو ہوتی رہتی تھی۔ ہمارے درمیان جو بے تکلفی اور اپنائیت تھی وہ ذرا مختلف نوعیت کی تھی۔ ایک ساتھ پڑھنے اور اتنا عرصہ اکٹھے رہنے کے بعد آپ کے تعلقات میں جو مخصوص ذہنی ہم آہنگی اور مزاج آشنائی

پیدا ہو جاتی ہے' وہی ہمارے درمیان موجود تھی۔ میں اُس زمانے میں سماج سدھار مہم کی سب سے بڑی علم بردار تھی۔ میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اپنی دوستانہ روش سے انتصار صاحب کے کردار کی خامیوں کو خوبیوں میں بدل دوں گی۔ اظہار میرے پاس آتا تو انتصار صاحب خاصی گہری نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیتے تھے۔ نہ ایک بار مجھ سے اس کے بارے میں استفسار بھی کیا مگر ڈھکے چھپے انداز میں۔ وہ ہمارے درمیان موجود تعلق کی نوعیت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے پھر یوں ہوا کہ انہوں نے دبے لفظوں میں اظہار کو کمپنی کے آفس آنے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا' جیسے اُن کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا ہو۔ ایک روز مجھے کہا کہ ایک پارٹی سے ملنے کے لیے جانا ہے۔ میٹنگ کے لیے ایک گیسٹ ہاؤس میں اہتمام کیا گیا ہے تاکہ امن و سکون کے ماحول میں بات چیت ہو سکے۔ مجھے اُن پہ اندھا اعتماد تھا' اُن کی دوستی پر ناز تھا۔ انہوں نے ابھی تک مجھ سے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی۔ اسی لیے گیسٹ ہاؤس گئی تھی۔ وہاں اندر کمرے میں داخل ہونے تک مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے بڑے دوستانہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ بڑی شائستگی سے مجھ سے کچھ فاصلے بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے براہ راست میری ذات کو موضوع گفتگو بنا لیا۔ آہستہ آہستہ ان کی باتوں اور نظروں میں بے باکی آتی گئی حتیٰ کہ ناقابل برداشت ہوگئی۔ میرے اندر کی عورت کی چھٹی حس نے بیدار ہو کر خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ انہوں نے بڑے دلار سے مجھے چمکارا کہ ہم دونوں دوست ہیں اور دوست ایک دوسرے کو پیار کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور تمہارے مہربان وجود کو اپنی تھکن سونپنا چاہتا ہوں۔ آؤ ایک دوسرے کی بانہوں میں دنیا کے سب غم بھلا دیں۔ میں بہت بکھرا ہوا ہوں' ایک دوست ہونے کے ناطے تم مجھے سمیٹ لو۔ دوستی کے تمام تر دعوؤں کا عملی ثبوت دینے کا یہی وقت ہے۔ آؤ دل کے انجوائے کریں ایک دوسرے کی قربت۔

میں یہ سب کچھ سن کر دھک سے رہ گئی۔ میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ عجب مدہوشی کے انداز میں اُٹھ کر مری طرف بڑھے اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے چھوتے میں نے پوری قوت سے چیخنا شروع کر دیا۔ انتظامیہ کے بندے دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور پھر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس وقت میرے دل میں انتصار نامی شخص کے خلاف شدید نفرت اور انتقام کے جذبات تھے۔

اس واقعے کے بعد میرا جی چاہتا تھا انتصار کی بوٹیاں کر ڈالوں' انہیں بم سے اُڑا دوں' ان کی شکل پر لعنت بھیجنے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے سر سے کہہ کر اپنا ڈیپارٹمنٹ تبدیل کروالیا اور فنانس ڈیپارٹمنٹ میں آ گئی۔ اظہار کو پتا چلا تو خاصا حیران ہوا اور پھر کچھ روز بعد آیا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ بے حساب مجھ پر برس پڑا اور بے نقط سنانے لگا۔

''کچھ عرصہ پہلے بھائی نے مجھ سے تمہارے متعلق پوچھا تھا کہ میں کس حد تک تم سے سیریس ہوں میں نے دوٹوک جواب دیا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور مستقبل میں اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ اس لڑکی کا کردار ٹھیک نہیں ہے۔۔ میرے انڈر کام کرتی ہے میں اسے جانچ رہا ہوں۔ میں نے جواب میں جذباتی ہو کر اُن کا گریبان پکڑ لیا اور تنبیہ کی کہ میں تنزیلہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ انہوں نے مجھے چیلنج کیا کہ میں ثابت کرسکتا ہوں کہ وہ کمزور نفس کی لڑکی ہے۔ میں دانہ ڈالوں تو میرے ہمراہ چلی آئے گی اور پھر کل رات انہوں نے وہ تصویری ثبوت میرے سامنے لا پھینکا۔

اظہار کے ہاتھ میں یہی دو تصویریں تھیں جو اس وقت تمہارے ہاتھ میں موجود ہیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ چپ سی ہو کر رہ گئی۔

میرا رواں رواں کان بن کر اس کی داستانِ حیات سن رہا تھا۔ وہ چُپ ہوئی تو میری آتش شوق سوا ہو گئی۔

''پھر کیا ہوا''؟ میں نے بے چینی سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

''کیا آپ نے اصل واقعہ اظہار بھائی کے گوش گزار کیا؟''

''اس وقت تو وہ کچھ سننے پہ آمادہ نہیں تھا بعد میں میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا مگر اس کے دل میں بدگمانی کا بیج بویا جا چکا تھا۔ گویا انتصار صاحب اپنے منصوبے میں بالآخر کامیاب ہو گئے تھے جس کے بارے میں ہمیں بہت دیر بعد پتا چلا۔ دراصل اپنی مخصوص فطرت کے باعث آفس میں کام کرنے والی ہر لڑکی کو اپنے دام میں اسیر رکھنا چاہتے تھے اسی لیے انہیں اظہار کا وجود کھٹکتا تھا۔ خصوصاً جب سے اظہار نے سنجیدگی سے میرے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا اُس کے بعد سے انتصار صاحب کے اندر انتقامی منصوبہ پرورش پانے لگا تھا۔ انہوں نے اظہار کو مجھ سے بدظن کرنے کے لیے یہ ہتھکنڈہ استعمال کیا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کھیلنا

چاہتے تھے۔ میری سادگی اور بھولپن سے فائدہ اُٹھا کر ایک طرف تو اس دوستی کی آڑ میں نفس کی تسکین کا سامان ہو جاتا اور دوسری طرف خفیہ تصاویر بنا کر اظہار کو پیش کرتے' اس کو مجھ سے متنفر کر دیا جاتا۔ ان کا ایک تیر تو نشانے نہیں لگا سکا مگر دوسرا شکار ضرور اُن کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اظہار ان تصاویر کو حتمی ثبوت جانتے ہوئے مجھ سے بدگمان ہو گیا اور اتنا دل برداشتہ ہوا کہ ملک چھوڑنے کا پروگرام بنا بیٹھا۔ باہر تو ویسے بھی اُسے جانا ہی تھا۔ یہ پہلے سے طے تھا۔ گھریلو حالات کے پیش نظر بڑے بھائی کا ہاتھ بٹانے کو وہ باہر جا کر ڈالرز کمانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس واقعے کے بعد وہ جلد از جلد ملک سے باہر جانا چاہتا تھا اور بالآخر چلا بھی گیا مگر واپس نہ آنے کے لیے۔ دیکھ لو چھ سال گزر چکے ہیں اور وہ واپس نہیں لوٹا۔''

''اوہ......'' میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ واقعی اظہار بھائی نے جرمنی جا کر پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ ڈرافٹ البتہ باقاعدگی سے بھیجتے رہتے تھے مگر تائی نوراں کے شدید اصرار کے باوجود وطن واپس پلٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

''تو کیا ابھی تک وہ یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ انتصار صاحب کے ساتھ انوالو ہیں اور......''

[illegible] نے تجسس سے وقت کے ساتھ ساتھ انسان کا شعور جوان ہوتا جاتا ہے۔ وہ کوک کا اسٹرا گھماتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ اس کی نظریں گلاس وال سے باہر ایک قطار میں گملوں میں رکھے اسٹاکس سے سرسبز پودوں پر تھیں۔

''اس نے جانے کے کوئی نو ماہ بعد مجھے فون کیا اور کہا۔ ''میں اندر کی بات جان گیا ہوں۔ اس وقت بھی سمجھ سکتا تھا' جب انتصار بھائی نے یہ سارا چکر چلایا تھا لیکن اس وقت ہوش سے زیادہ اشتعال نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ انہوں نے کچھ روز قبل فون پہ باتوں کے دوران یونہی کہہ ڈالا کہ یار وہ تمہاری کلاس فیلو تنزیلہ اکرام اچھی خاصی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ میں تو یونہی سمجھتا تھا۔ ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی ہے۔ پیسے والی ہے۔ تم چاہو تو تمہارے لیے بات کر لیں' اس کے باپ سے......؟'' میں ان کی جبلت سے آگاہ تھا۔ وہ تاعمر تمہیں میرے حوالے سے محترم و معتبر نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے کہ وہ ایک بار خود سے منسلک ہو جانے والی لڑکی سے تاعمر بے تکلفی برتنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ میں تمہیں کس طرح اپنے گھر لانے کا سوچوں' جہاں انتصار بھائی جیسے بدنظر اور بد باطن شخص سے تمہارا مستقل قسم کا قریبی رشتہ بن جائے گا۔ انتصار بھائی کی خود پسندی اور ہوس پرستی

نے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کو حسرت میں بدل دیا ہے۔"

"پھر آپ نے اُن کو جواب میں کیا کہا؟"

میں نے بے قراری سے اُسے دیکھا۔

اس نے طویل سانس لے کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے اور مبہم سا مسکرائی۔

"کچھ بھی نہیں' میں کیا کہہ سکتی تھی۔ اس نے درست کہا تھا۔ جب اتنی بڑی تلخ حقیقت درمیان میں موجود تھی جس کے باعث تعلقات کی بے ساختگی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ پرانے انداز نہیں لوٹ سکتے تھے۔ کچھ کھو جانے والی چیزیں دوبارہ نہیں ملا کرتیں۔"

مجھے یاد آیا' ایک بار اُس نے کہا تھا۔

"کھوئی ہوئی محبتیں کبھی واپس نہیں ملتیں۔" گویا یہ اعتراف تھا۔

"مگر کھوئی ہوئی محبت واپس مل بھی تو سکتی ہے۔ آپ دونوں کے درمیان محبت تو تھی۔ اس رشتے کے ساتھ کمپرومائز کیا جاسکتا تھا۔"

اس نے عمیق نگاہ مجھ پر ڈالی پھر اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولی۔

"خدا جانے وہ محبت تھی بھی کہ نہیں۔ کم از کم مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"کمال ہے۔ آپ یہ بھی نہ سمجھ سکیں؟ ظاہر ہے' آپ دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی اور نہ کبھی اس کو اس انداز مین سوچا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوا' مجھے اس پر افسوس تھا' رنج تھا اور اب بھی ہے۔"

"احساس زیاں بذات خود اقرار محبت کی علامت ہوتا ہے۔ تبھی تو آپ نے چھ برس گزر جانے کے باوجود شادی نہیں کی۔ شاید لاشعوری طور پر آپ کو اظہار بھائی کا انتظار ہے۔" مجھے اپنی کہی ہوئی بات سچ لگ رہی تھی۔

"ضروری نہیں ہے جو تم سوچو' وہ سچ ہو۔ شادی نہ کرنے کی وجہ کچھ اور ہے۔ لتصار صاحب کے کردار میں مرد کے اتنے مکروہ روپ سے میں آگاہ تھی کہ آئندہ زندگی میں کسی مرد کو اپنی ذاتیات میں شامل کرنے سے توبہ کر لی۔ مجھے مردوں سے عجیب سی گھن آنے لگی تھی۔"

"آپ نے لتصار صاحب سے انتقام کیوں نہ لیا.....!؟" پہلے فوری ردِعمل کے طور پہ یہی سوچا تھا پھر میرے اندر کی متحمل مزاج لڑکی نے مجھے اس اقدام سے روک دیا۔ اگر ایک شخص

آپ پر کیچڑ اُچھالے تو جواب میں اُس پر کیچڑ اُچھالنے سے پہلے آپ کو اپنے ہاتھ بھی کیچڑ سے آلودہ کرنے پڑیں گے۔ عارف شفیق صاحب کا شعر ہے ناں......

وار کر سکتا تو ہوں میں اپنے دشمن پر مگر
سوچتا ہوں درمیاں پھر فرق کیا رہ جائے گا

یوں بھی معاف کر دینا بہترین انتقام ہوا کرتا ہے۔"

اُس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اُس رات میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

کتنی عجیب داستان تھی۔ بظاہر کتنی عام مگر باطن بالکل مختلف' اس کی ذات کی طرح۔ جو دیکھنے میں بہت عام سی لگنے کے باوجود خود بخود خاص بنتی چلی جاتی ہے۔

مجھے پچھلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

جب وہ لتصار بھائی کی فطرت کے حوالے سے تفصیلی تجزیہ کرتی تھی۔

میرے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہوئے مشورہ دیتی تھی۔

جب بھی محبت کے موضوع پر بات ہوئی' وہ بلاوجہ کترا جاتی تھی۔ مانتی ہی نہیں تھی۔

"خیر مانا تو اب بھی نہیں" مجھے دھیان آیا' اُس نے بڑے بے تاثر اور سپاٹ انداز میں اپنے اور اظہار کے درمیان موجود رشتے کی وضاحت کی تھی۔

کیا اُس کے دل میں اظہار کیلیے نرم گوشہ ہے؟

'کیا وہ اس سے محبت کرتی ہے.....؟

اگر ایسا نہیں ہے تو تو پھر کس بات کا انتظار ہے اِسے۔ اپنی زندگی یونہی بے کار کیوں گنوا رہی ہے؟"

'مگر وہ خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ میں نے اظہار کے بارے میں کبھی ایسی انہیں سوچا تھا' اسے اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔"

مجھے احساس ہوا جیسے اس سوچ نے میری پژمردگی اور افسردگی رفع کر ڈالی ہو.....مگر کیوں؟

اس سوال کا جواب میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔

"یہ بتاؤ گھر والوں کی کوئی خیر خبر ہے کہ نہیں اور تنزیلہ رحمٰن کا قصہ کیا ہوا۔" ایک روز جب

میں بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کی خوش خبری سنانے کیلیے اُس کے پاس پہنچا تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد معاً وہ پوچھ بیٹھی۔

مجھے یوں لگا جیسے نئے سرے سے میرے زخم تازہ ہو گئے ہوں۔

''چھوڑیے ان باتوں کو۔ راکھ کریدنے سے کیا حاصل۔'' میں سرد آہ بھری۔ ''میں نے تو گننا بھی چھوڑ دیا ہے کہ انہیں دیکھے کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔''

میں نے سر جھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور بات بدلتے ہوئے بولا۔

''اچھا اب بتائیے ناں' ایم۔ اے میں کون سا سبجیکٹ رکھوں۔'' میری سنجیدگی اور تعلیم سے رغبت نے اُسے سرشار سا کر دیا۔ وہ مسکرا دی۔

''مجھے بہت اچھا لگا ہے' تمہارا یہ ذمے دار اور مہذب انداز۔ اب تم وقت اور زندگی کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ ہو چکے ہو۔ بہت خوب!''

میرے دل میں پرانے درد کروٹ لینے لگے۔ کتنی عجیب سی بات تھی' دو سال گزر گئے تھے اور میں نے پلٹ کر لاہور والوں کی خیر خبر نہ لی تھی۔ تنزیلہ والے معاملے میں کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ ماہرہ' انتصار بھائی اور ایاز بھائی کے رشتوں کا کیا بنا۔

سب کچھ فراموش کر دیا تھا۔ تنزیلہ اکرام نے مجھے اس طرح اپنے پھیلائے ہوئے طلسم میں جکڑا ہوا تھا کہ مجھے زمان و مکان کا ہوش بھی بھول گیا تھا۔ بس اپس کے بنائے ہوئے دائروں میں گردش کرتا رہتا تھا۔

شب کو سوچنے بیٹھا تو چھم سے تنزیلہ رحمٰن کی موہنی صورت تخیل کے پردے پر اتر آئی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی کھوج میں اتنی دور نکل جاتا ہے جہاں سے واپسی قریباً ناممکن ہی ہوتی ہے۔ شاید میں بھی بہت دور نکل آیا تھا۔

نہ رشتوں کی طلب رہی تھی' نہ محبت کی شدتوں کی چاہ۔

کبھی کہیں پڑھا تھا۔ کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کی خواہش ترک کر دو' وہ چیز خود بخود تمہارے قدموں میں آ گرے گی۔

ایک دانا یہ بھی کہہ گزرے ہیں۔

''اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا ارادہ باندھ لیا تو یقین مانو' تم نے دنیا کا سب سے بڑا

فن سیکھ لیا ہے۔''

شاید نادانستگی میں' میں یہی ہنر سیکھ رہا تھا' تنزیلہ اکرام کی رفاقت میں۔

کبھی وہ دور تھا' جب دل کے سمندر میں اک طوفان مچا رہتا تھا ہر آن اور اب یہ عالم تھا جیسے سمندر کی فضا پر مستقل سکوت چھایا ہوا ہو۔ ایک وہ دور تھا جس میں زندگی کے لیے ترس گئے تھے اور اب۔

میں تصور کی آنکھ سے خود کو اس کے روبرو محسوس کرنے لگا پر نہ جانے کیا ہوا' مجھے لگا جیسے مرا دم گھٹا جا رہا ہو۔ مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ میں پرانی یادوں سے فرار چاہتا تھا۔

تجھ کو معلوم ہے
ناراضگیاں درد بڑھا دیتی ہیں۔
نہ کوئی بولے گا
نہ تجھ کو منائے گا کوئی۔
خشک آنکھوں کے کسی ترچھے کنارے پہ پڑے۔
درد بھرے شکوے کی چنگاری سے
دیر تک تجھ کو جلائے گا کوئی
دیر تک تجھ کو رلائے گا
یار اس شہر نہ جا
یار اس شہر نہ جا
ہمیں اُجڑی ہوئی گلیوں سے ڈر لگتا ہے۔
کون جانے کہ کہاں گھات لگی ہو دکھ کی
یار اس شہر نہ جا......

ان یادوں کے آکٹوپس سے دل کو چھڑانے کے لیے میں اگلے روز تنزیلہ اکرام کے روبرو پہنچ گیا کہ وہی اِک جائے قرار تھی۔

''کیا بات ہے۔ بہت بے چین لگ رہے ہو۔''

اس نے لمحوں میں میرے اندر کی شکست و ریخت اور توڑ پھوڑ کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"تنزیلہ جی۔ جب نہ ماضی میں چین ملے' نہ حال میں دل لگے اور نہ مستقبل کے خواب بننے کو جی چاہے تو ایسے میں کیا کرنا چاہیے۔ایسا کب اور کیوں ہوتا ہے؟"

میں کرسی کے ہتھے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتا ہوا بے کلی سے پوچھ رہا تھا۔تنزیلہ تادیر مجھے گہری ٹٹولتی ہوئی عمیق نظر سے دیکھتی رہی۔

"ایسا تب ہوتا ہے' جب انسان اپنے اندر سے اُٹھتی آوازوں کو سننے سے انکاری ہو جاتا ہے۔جہاں تک "کیوں" کا تعلق ہے تو وہ اس لیے کہ انسان اپنے آپ سے فرار چاہتا ہے۔"

"اپنے آپ سے فرار کب چاہتا ہے؟" میں نے ایک معمول کے سے کھوئے کھوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"جب وہ کسی واشگاف حقیقت کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتا یا کسی فیصلہ کن موڑ تک نہیں پہنچ سکتا۔" وہ اپنے ازلی پرسکون انداز میں گویا تھی۔

"تم دو خواہشوں کے بیچ پھنسے ہوئے شخص نظر آرہے ہو۔ایسا محسوس ہوتا ہے' جیسے تم کسی ایک خواہش کا انتخاب نہیں کر پا رہے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں خواہشوں کو بروقت پورا کرنے کی استعداد بھی نہیں رکھتے۔تمہیں لازماً کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے جو تم سے ہو نہیں پا رہا۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" میں بے خیالی میں اپنے لہریے دار بالوں میں انگلیاں گھمانے لگا۔

اس کی بات دل کو تو لگ رہی تھی مگر ذہنی سطح پر اپروچ نہیں کر پا رہی تھی۔

"دیکھو زندگی ایک وسیع کینوس کی طرح پرت پرت تمہارے سامنے کھلی پڑی ہے۔اب تم اس اسٹیج پر پہنچ گئے ہو جہاں اپنا برا بھلا خود سوچ سمجھ سکتے ہو۔اپنے لیے کسی ایک راہ کا انتخاب کرلو۔ فیصلہ تو تمہیں بہرحال کرنا ہی ہے۔بیچ میں کب تک لٹکتے رہو گے۔اچھا سنو۔وہ جو تم ٹی وی پروڈیوسر ناصر حیات کے ڈرامے میں کام کرنے والے تھے' اس کا کیا بنا؟" اس نے میرا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔

"اوہ ہاں۔میں تو بھول ہی گیا تھا۔پچھلے سال اُس سے ملاقات ہوئی تھی ایک روز۔اس نے ٹی وی اسٹیشن آنے کے لیے کہا تھا مگر میرا موڈ نہیں تھا۔" مجھے اچانک ہی یاد آیا تھا۔

"اب موڈ کیسا ہے؟"

اُس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب کیا ارادہ ہے ٹی وی میں کام کرنے کے بارے میں۔

"آپ بتائیے۔آپ کے خیال میں مناسب رہے گا؟"

میں نے سعادت مندی سے گیند اُس کے کورٹ میں ڈال دی۔اب میں نے اپنی سوچ اور اپنے عمل کی ڈور اُسی کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

"میں تو اسے وقت کے زیاں کا نام دیتی ہوں۔ٹی وی اور فلم میڈیا میں وہی شخص کام کرسکتا ہے جسے جنون کی حد تک شوق ہو یا پھر اس کے پاس ڈھیروں ڈھیر فالتو بے کار وقت موجود ہو۔ تمہیں کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے اور نہ وقت کی فراوانی ہے۔اس لیے میرا خیال ہے' تم رہنے دو۔"

"جو حکم۔" میں نے رضامندی سے شانے اُچکا دیے۔

"ایک بات بتائیں گی تنزیلہ؟"

یونہی میرے ذہن میں یہ خیال آ گیا تھا۔

"ہاں پوچھو"

اُس نے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر اظہار بھائی وطن واپس آجائیں تو کیا آپ اُن سے ملاقات کریں گی۔اُن سے ملنا پسند کریں گی؟"

اُس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمودار ہونے لگی۔پلکیں خود بخود جھکنے لگی تھیں اور وہ مضطربانہ ہاتھوں میں دبا ٹشو مروڑنے لگی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" بہت دیر بعد اُس نے سر اُٹھا کر دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔اس کے انداز کی خفیف سی آزردگی مجھ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

"یہی کہ آپ کے دل میں آج بھی اُن کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔آپ کو غیر ارادی طور پر اُن کا اظہار ہے۔یا کبھی نہ کبھی ملنے کی آس ہے۔آپ اب بھی اُن کو یاد کرتی ہیں۔"

میں نے زور دے کر آہستہ آہستہ اپنی بات مکمل کی تھی۔

وہ جواب میں کچھ دیر تک خاموش رہی پھر مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم اپنے تجربے کو میرے ساتھ کمپیئر مت کرو۔تمہاری داستاں کوئی اور ہے میرا واقعہ کوئی اور ہے۔میری فیلنگز کا صحیح اندازہ لگانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے اس لیے کہ تم محبت کو بڑے

مختلف انداز میں لیتے ہو۔تم جذباتی محبت کو اہمیت دیتے ہو جبکہ میں روحانی محبت پر یقین رکھتی ہوں۔ وہ محبت کی انتہا انسانیت ہے۔تمہاری طرح کی جذباتی محبت کی انتہا عموماً حیوانی سطح پر جسمانی فتح تک محدود رہتی ہے۔تم جذبے کو اہمیت دیتے ہو اور میں جذبے سے زیادہ احساس کو ویلیو دیتی ہوں۔جذبہ تسکین چاہتا ہے اور احساس سکون کی طلب کرتا ہے اور سچ پوچھو تو انسانی وجود کی بقا تسکین میں نہیں بلکہ سکون میں مضمر ہے مگر تم اس نکتے کو نہ سمجھ سکو لہذا اس موضوع کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

♥♥♥

اُس دن میں جناح سپر میں "گفٹ شاپ" میں داخل ہوتے ہوئے تنزیلہ اکرام کی پسند کے بارے میں مخمصے کا شکار تھا۔بڑے دنوں سے میں منصوبہ بنا رہا تھا کہ اس بار تنخواہ ملے گی تو اس کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ لوں گا۔میرا اس شہر میں اُس کے سوا کوئی اپنا تھا بھی تو نہیں۔اُسکی ذات پر کرچ کر سکتا تھا۔

"کوئی جیولری لوں یا پرفیوم؟" میں انگلی سے کنپٹیاں بجاتا ہوا خود کو اچھا خاصا احمق محسوس کر رہا تھا۔

"یار کتنی رہتی ہے تمہاری شاپنگ! دیکھو منے میاں بُرے بُرے منہ بنا رہے ہیں پرام میں بیٹھے ہوئے۔" ایک بھاری گونجیلی اپنائیت بھری آواز پر میں نے پلٹ کر یونہی ایک لحظے کو شاپ میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اس جوڑے کو دیکھا۔

ایک تیئس پینتیس سال کا خوش شکل رعب دار مرد پرام میں بیٹھے گول مٹول گلابی رخساروں والے پیارے سے ایک سالہ بے بی پر جھک کر اپنی بیگم سے کہہ رہا تھا۔بیگم کی میری طرف پشت تھی۔

"صبر کریں ناں۔ مجھے اَبی جی کے لیے گفٹ سلیکٹ کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہی خوب صورت کپڑوں اور جیولری سے لدی پھندی بشاش چہرے والی خاتون پوری طرح گھوم کر میرے سامنے آ گئی تھی۔

اور میں بحیرِ تحیر میں غوطے لگانے لگا۔ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ جونہی

خاتون کی نگاہ مجھ پر پڑی' وہ تڑپ کر میری سمت بے قراری سے لپکی تھی۔

''تحریم......تحریم......میرے بھائی۔'' انہوں نے والہانہ مجھے خود سے لپٹا لیا۔

''سیما آپا۔'' انہیں شانے سے لگاتے ہوئے شدت جذبات سے میرا لہجہ چھلک پڑا تھا۔ کتنی مدت بعد کسی خون کے رشتے کو مقابل دیکھا تھا۔ وہ جذباتی ہو کر دھواں دھار رو رہی تھیں۔

''امی اور ابا جان کیسے ہیں اور سب گھر والے''؟ بے ساختہ ہی میرے لبوں سے پھسل پڑا تھا۔ دل عجب طریقے سے گداز ہوا جا رہا تھا۔ شاید خون کی اپنی ایک مہک ہوتی ہے۔

''تمہیں کیا ہم جئیں یا مریں۔'' وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر الگ ہو کر خفا ہونے لگیں۔

''پھر تم نے کون سا پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تمہارے لیے تو ہم سب مر چکے تھے ناں......؟''

''سیما۔ پلیز یار اتنے عرصے میں بعد ملی ہو چھوٹے بھائی سے۔ اس طرح بی ہیو کرتے ہیں۔'' میں نے اُس شاندار سے مرد کے نفیس لہجے سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر سوالیہ نظروں سے سیما آپا کی طرف دیکھا۔

''تمہارے دلہا بھائی ہیں' میجر ڈاکٹر طارق محمود۔ پنڈی میں سی ایم ایچ میں ہوتے ہیں۔''

''اوہ۔'' میں گرم جوشی سے اُن سے ملا۔ ''میرے اپنے مجھ سے اتنے قریب تھے اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔''

''تم نے اپنا کوئی اتا پتا بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔'' سیما آپا پھر شکوہ کناں ہوئیں۔

''کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے مگر تم نہ مل سکے۔ اکبر تایا کی فیملی بھی تمہارے ٹھکانے سے لاعلم تھی۔ ہم لوگ تو تمہاری تلاش میں پاگل ہو گئے۔ خبر ہے' کتنی بڑی تبدیلی آئی ہے تایا اکبر کی فیملی سے ہمارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں۔ ماہرہ اور تمہاری منگنی ابا جی نے ختم کر ڈالی ہے۔ ایاز بھائی نے بھی غیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتصار بھائی کے ایم این اے کی بیٹی سے شادی رچانے کے عمل کے خلاف ردِعمل کے طور پر اپنا رشتہ اُدھر کرانے سے انکار کر دیا۔ اب تم آزاد ہو۔ ابا جی نے فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔ گھر والے تمہیں سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں۔ ابا جی اور

امی جان نے کہا ہے کہ تحریم اپنی مرضی سے جہاں کہے گا' ہم اُس کا رشتہ لے جانے کو تیار ہیں۔ اُس کی پسند کی لڑکی کو بہو بنانے کے لیے بخوشی راضی ہیں۔ اب تم گھر واپس پلٹ جاؤ۔ سب شدت سے تمہارے منتظر ہیں اور ہاں' وہ تنزیلہ رحمٰن کے مجھے اکثر فون آتے رہتے ہیں۔ تمہیں خبر ہی ہو گی۔ اُس کو پچھلے سال طلاق ہو گئی تھی اور اس نے مجھے تمہارے لیے یہ پیغام دیا تھا کہ اس کے ڈیڈی مان گئے ہیں۔ تحریم جب چاہے اپنے گھر والوں کو بھیج دے۔''

سیما آپا بغیر سانس لیے ایک ساتھ سارے انکشافات کرتی چلی گئیں۔

اور میں اپنی جگہ گُنگ سا کھڑا رہ گیا۔ جن باتوں کو جواز بنا کر گھر سے نکلا تھا' وہ آناً فاناً ختم ہو گئے تھے۔

♥♥♥

سب مسائل حل ہو گئے ہیں۔ جیسا میں چاہتا تھا' ویسا ہو گیا ہے۔ میری آرزو اور خواہش کے عین مطابق۔''

اگلے روز میں تنزیلہ اکرام کے روبرو تھا۔ وہ یہ غیر متوقع خبر سن کر خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''اچھی بات ہے۔ اب دیر کس بات کی ہے۔ کل ہی یہاں سے بوریا بستر سمیٹو اور لاہور روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے مشقت کے دن ختم ہو گئے ہیں بالآخر۔ جاؤ اب اپنے بھائی کے ساتھ ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں مالکانہ ذمے داریاں سنبھالو یا اپنی فیکٹری کے انتظامات دیکھو۔ اب تو ہر گتھی سلجھ گئی ہے۔ گھر والے تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ ایک خوشگوار بھرپور اور آرام دہ زندگی منتظر ہے۔ جاؤ اُس کا استقبال کرو۔''

میں نے بہت گہری نگاہ سے اُس کا جائزہ لیا۔ وہ بڑے رسان سے کہہ رہی تھی۔ میں اس کے شگفتہ لہجے میں محظوظ نہ ہو سکا۔

''پتا نہیں' گتھی سلجھی ہے یا ایک بار پھر اُلجھنے کی تیاری کر رہی ہے۔'' میں متفکر لہجے میں بے چینی سے گردن اِدھر اُدھر جھٹکتا ہوا بولا۔

''تمہیں اللہ سے اچھی اُمید رکھنی چاہیے اور بہت زیادہ خوش ہونا چاہیے کہ بالآخر تم نے زندگی کا جو مقصد بنایا تھا' وہ پورا ہو گیا۔ تم تنزیلہ رحمٰن کو حاصل کرنا چاہتے تھے ناں' سو وہ اب تمہاری دسترس میں ہے۔ تم ہاتھ بڑھاؤ گے تو پا لو گے۔''

''کبھی اُس کے وصال کو سمجھا تھا مقصد حیات مگر نہ جانے کیوں آج اس منزل پہ پہنچ کے احساس ہو رہا ہے کہ یہ منزل نہیں ہے' عارضی پڑاؤ ہے۔ منزل تو ابھی آگے آئے گی۔'' میں اکتائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے تنزیلہ۔''

''خواہش کا سارا حسن ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ وقت پہ پوری ہو جائے اگر ایسا نہ ہو تو یہ خواہش جھنجلاہٹ میں بدل جاتی ہے۔ جھنجلاہٹ مایوسی پیدا کرتی ہے۔ مایوسی تھکا دیتی ہے اور جب انسان تھک جائے تو پھر کو خواہش کے حصول کے پیچھے بھاگنے ترک کر دیتا ہے۔ اُس کے بارے میں سوچنا ختم کر دیتا ہے اور بہت مدت بعد جب یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے تو پھر انسان کی کچھ ایسی ہی فیلنگز ہوتی ہیں' جیسی اس وقت تمہاری ہو رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے' روئے یا ہنسے۔ ایک عجیب سی بے حسی اور انجماد طاری ہو جاتا ہے۔''

مجھے اُس کی بات سولہ آنے درست لگی۔ یوں لگا جیسے میرے دل کے جذبات کی ترجمانی کی ہو۔

اک عمر جسے خواب کی مانند ہی دیکھا
چھونے کو ملا ہے تو پریشان بہت ہوں
اُلجھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

وہ مجھے مل تو گئی تھی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

''تنزیلہ'' میں نے سوچ میں گم ہو کر اُسے پکارا۔

وہ سوالیہ نظروں سے میرے چہرے پر بکھرے عجیب سے تاثرات پڑھ رہی تھی۔

''مجھے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔ یوں جیسے میری سوچوں کی عکاسی کر رہے ہیں۔''

''جی ارشاد۔''

بدل گئے مرے موسم تو یار اب آئے
غموں نے چاٹ لیا' غمگسار اب آئے
یہ وقت اس طرح رونے کا تو نہیں لیکن
میں کیا کروں کہ میرے سوگوار اب آئے''

"زبردست۔ بہت اچھے۔ اب ذرا اس کی وضاحت بھی فرما دو۔" وہ غیر معمولی طور پر تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔

"وضاحت کیا کروں۔" میں نے آسمان پہ اُڑتے پرندوں پہ نگاہ جماتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"سب کچھ آپ کے سامنے ہی تو ہے۔ کن حالات میں گھر سے نکل کر در بدر ہوا' ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اُس وقت میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ پیسہ' نہ تعلیم اور نہ تجربہ۔ تب کسی کے دل میں میرا خیال نہیں جاگا تھا۔ خاندانی رسم ورواج اور روایات میری ذات سے بڑھ کر عزیز تھیں اور اب جبکہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہوں۔ اپنی زندگی خود بنا چکا ہوں۔ اپنی خواہشات ترک کر چکا ہوں تو انہیں میرا خیال آ گیا۔" میں بہت تلخ ہو رہا تھا۔

"درست۔ مگر تحریم اس سارے قصے میں تنزیلہ کا کوئی قصور نہیں نکلتا۔ تم ماضی کی تلخیاں بھلا کر صرف اُس کے بارے میں سوچو جس کے لیے تم نے اپنی ذات کی نفی کر ڈالی تھی۔"

میری نظروں میں تنزیلہ رحمٰن کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات در آئے۔

ایک لمحے کو ہجر و وصال کے سارے موسم
آنکھوں میں لہرا سے گئے
دل میں چراغ سے جل اُٹھے
اُس سے گلے ملنے کے تصور سے ہی
جیسے سارا وجود
پھول کی صورت کھل اُٹھا
ان ہاتھوں کے لمس کو سوچ کے
سارا جسم سلگ اُٹھا
اُن ہونٹوں کی گرم گلابی نرمی کا جوش رنگ خیال
ہونٹوں پہ مسکا اُٹھا

اور پھر میں لاہور چلا آیا۔ تنزیلہ رحمٰن سے ملنے کے لیے۔

♥♥♥

ایک عمر کے بعد اُس کو دیکھا تھا۔ اُس کا بے ایمان کر دینے والا حسن وشباب مزید فتنہ ساماں ہو گیا تھا۔ وہ اسی وارفتگی سے مجھ سے ملی تھی۔

آنکھوں میں جذبے رقص کر رہے تھے
ہونٹوں پہ دلنواز تبسم کھیل رہا تھا۔
مگر چہرے پر اُداسیوں کے موسم ٹھہر سے گئے تھے۔

"تحریم۔" اس کی کانپتی آواز میں جدائی جھلک رہی تھی۔ اس کا وصال ساماں انداز لمحے بھر میں مجھے موم بنا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے اُس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تم کتنے بدل گئے ہو۔" وہ مخمور نظروں سے میرا سراپا جانچ رہی تھی۔

بیس اکیس برس کا نوخیز لڑکا اب چھبیس برس کا بھرپور مرد بن چکا تھا۔ سرخی مائل عنابی ہونٹوں پر بھوری گھنی مونچھیں آویزاں تھیں۔ نوخیز لمبا سا لڑکا بھرے بھرے صحت مند کسرتی جسم والے جوان میں بدل چکے تھا۔

"تم خود بھی تو بدل گئی ہو۔" میں نے گہری نظر سے اس کو دیکھا اُس کا جوبن مزید کھل اُٹھا تھا۔

"اب کیا کہتے ہیں تمہارے ڈیڈی۔" میں نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے تنکا توڑا۔ لہجہ سپاٹ تھا۔

''مجھ سے تو نہیں ممی سے دبے لفظوں میں کہا تھا کہ تنزیلہ اگر چاہتی ہے تو اُس کے گھر والوں کو بلوا سکتی ہے مگر تحریم' کیا تمہاری فیملی مجھے اس طرح قبول کر لے گی؟''

اس کے چہرے پر خدشات بول رہے تھے۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر نظر موڑ لی۔

''تم میرے دل کی خوشی ہو۔ میرے لیے اس گھر میں آؤ گی۔ وہ اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے اب۔ وہ جان گئے ہیں کہ میں ہٹ کا پکا ہوں۔''

'میں نے سنا ہے' تمہارے اسلام آباد میں قیام کے دوران تنزیلہ اکرام نے تمہاری بہت مدد کی ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے ناں جسے تم نے بہن بنایا ہوا ہے''

معاً مجھے یوں لگا' جیسے کسی نے مجھے اُلٹی چھری سے ذبح کر دیا ہو۔ میرا دوران خون تیز ہو گیا۔ مٹھیاں بھینچ گئیں اور چہرہ لہو رنگ ہونے لگا۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے ہوئے میں نے ایک آتشیں سیال مادے کو اپنی رگ رگ میں اُترتا محسوس کیا تھا۔ حق نواز شاہ کے فلیٹ میں پیش آنے والا واقعہ میری نظروں میں گھوم گیا تھا۔

میں اضطراری انداز میں میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ضبط سے میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں؟'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''چلو' تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' میں بھینچے بھینچے لہجے میں بمشکل تمام کہا۔ میں نظریں نہیں اُٹھا پا رہا تھا۔

وہ سٹپٹا کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ بے تابانہ میری کلائی اپنے سفید مخروطی گداز ہاتھ میں تھام کر چیک کرنے لگی۔

''ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔ تم بائیک پر بیٹھو فٹافٹ۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

میں بے دردی سے بازو چھڑا کر بائیک سٹارٹ کرنے لگا۔

♥♥♥

''مس تنزیلہ۔ آپ نے زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' میں ٹھوڑی ہاتھ پر جمائے سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''زیادہ گزر گئی ہے' تھوڑی رہ گئی ہے' سو وہ بھی گزر جائے گی۔ سوچنا کیا ہے۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر مزاج کا رنگ دینا چاہا تھا۔

''یہ تو کوئی ہوش مندانہ سوچ نہیں۔'' میں نے بھویں اُچکائیں۔ ''شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے بالآخر اپنے دل کا سوال پوچھ لیا۔

''شادی!'' وہ بے ساختہ مسکرائی۔ ''مگر کس سے؟''

میں ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔

''کسی سے بھی۔'' میں نے ایک نظر اُس پر ڈال کر نگاہ بچاتے ہوئے کہا۔

''مثلاً!'' وہ حظ اُٹھا رہی تھی۔

''مثلاً؟ مثلاً۔'' میری زبان لڑکھڑا سی گئی۔ ''بھئی' کوئی بھی معقول انسان۔''

''وہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔'' اُس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

''ہو سکتا ہے' ہو چکا ہو مگر آپ کو خبر نہ ہو۔ آپ کو تو یوں بھی دوسروں کے جذبات کی گہرائی تک پہنچنا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے چاہتے ہوئے بھی طنز کر بیٹھا۔

اُس نے قدرے اچنبھے سے مجھے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ البتہ اس کے چہرے کے تاثرات گمبھیر ہو گئے تھے۔

"میں اظہار بھائی کی بات کر رہا ہوں جن کا آپ کو انتظار ہے۔"

میں نے اُس کے تاثرات جاننے کے لیے اُس کا چہرہ بغور ٹٹولا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں اُلجھا کے اپنے اضطراب پر قابو پا رہی تھی۔

"مجھے کسی کا انتظار نہیں ہے۔ یہ بات میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔" اس کا کمزور لہجہ اس کے سخت جملوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"جھوٹ کہتی ہیں آپ۔" میں چیخ پڑا۔ "آپ انہی کے انتظار میں ابھی تک تنہا ہیں۔ آپ اُن سے محبت کرتی ہیں۔"

"مجھے کسی سے محبت وحبت نہیں ہے۔ سمجھے تم۔" وہ میرے ہذیانی انداز پر ایک لمحے کو بھونچکا رہ گئی پھر سختی سے ڈانٹ کر کھردرے انداز میں بولی۔

"اور نہ ہی میں کسی انہونی کے انتظار میں ہوں۔"

"تو پھر۔ تو پھر میرا انتظار اور اضطراب ختم کر دیں۔ میری محبت قبول کر لیں۔" لمحے کے ہزارویں حصے میں، میں اُس کے قریب آیا اور اُس کے دونوں بازو تھام کر ایک جھٹکے سے اسے خود سے قریب کر لیا۔

ہم اس وقت "روز اینڈ جیسمین گارڈن" کے ایک ویران، سنسان اور الگ تھلگ سے گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں دور دور تک کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ مجھے جانے کیا ہوا کہ ایک دم جذباتی ہو گیا تھا۔

اس ناقابل تسخیر قلعے کو فتح کرنا میرے لیے چیلنج بنتا جا رہا تھا۔

دوسرا لمحہ قیامت کا تھا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے علیحدہ ہوئی تھی اور پھر ایک، دو، تین... وہ مسلسل تھپڑ مارتی چلی گئی۔ جیسے عالم جنون میں ہو۔ میری تمام تر حسیات یکلخت کسی برفیلے تودے میں دبتی چلی گئیں۔ میں دم بخود سا کھڑا رہ گیا۔

"کیا سمجھے تھے تم۔ اپنی نفس پرستی سے مجھے زیر کر لو گے؟" بالآخر وہ ہانپتی ہوئی رک گئی اور غرّا کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں برس رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہینڈ بیگ سے چھوٹا سا ریوالر نکال کر مجھ پر تان لیا۔

میرے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ وہ دیوانے پن کی سرحدیں چھو رہی تھی اور غیظ وغضب

سے لرز رہی تھی۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے۔

"ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گولی مار دوں گی۔" اُس نے غیر محسوس طریقے سے پیچھے سرکتے ہوئے سخت اور بے لچک انداز میں تنبیہ کی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات اُس کے لہجے کی سچائی کے گواہ تھے۔

"یہ انتظام میں نے کسی ایسی ہی غیر متوقع صورت حال سے نپٹنے کے لیے کیا ہوا تھا۔ ایک بار تمہارے ہاتھ سے بے وقوف بن گئی تھی، دوبارہ رسک کیسے لے سکتی تھی۔ سنو تحریم! آج میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے اُس دن کے اذیت ناک واقعے کو فراموش کر کے کیسے تم سے ازسرِ نو تعلق جوڑا۔ بیٹھ جاؤ یہاں۔" اُس نے رعب سے ڈپٹ کر کہا۔

میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ گرنے کے سے انداز میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگا کے میکانکی انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بہت محتاط اور الرٹ ہو کر بیٹھ گئی۔

اس کے چہرے کے تاثرات اتنے عجیب اور ایک دم برفیلے سے ہو رہے تھے کہ میں کچھ بھی اخذ کرنے میں ناکام ہوا جا رہا تھا۔

"سنو مسٹر تحریم اختر۔" اچانک اُس نے زہرخند ہو کر عجیب سراتے ہوئے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

"مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔ ازسرِ نو ربط بڑھاتے ہوئے مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ایسا ہو گا۔ اس لیے کہ غیر مرد اور عورت کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو اُس کی انتہا نفس کی تسکین ہی ٹھہرتی ہے۔ سو اب تم نے بذاتِ خود تجربہ کر کے دیکھ لیا ناں کہ مرد عورت کی دوستی کیونکر پاکیزہ نہیں رہ سکتی۔ دوستی تو دوستی بھائی بہنا یا تک بھی نفس کے ریلے میں بے جان تنکے کی مانند بہہ جاتا ہے۔ مرد عورت میں جنس کے ماسوا کوئی تعلق نہیں قائم رہ سکتا۔ یہ حقیقت ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود میں نے تم سے رابطہ کیوں کیا؟"

واقعی میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ اُس نے میری سزا کیسے معاف کی، نئے سرے سے مجھے اعتبار کے قابل کیونکر جانا تھا۔

"سنو تحریم اختر۔" معاً اس کا لہجہ ایک دم اجنبی بن گیا۔

''فلیٹ میں جس طرح تمہارے اندر کا انسان باہر آیا تھا اور جو کچھ میری نظر نے دیکھا اور جانچا تھا' اُس دن اُس لمحے سے میرے دل میں تمہارے لیے صرف نفرت کا شدید غضب ناک جذبہ اور کراہیت آمیز احساس باقی رہ گیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نفرت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ میرے دل سے تم اُس روز نکل گئے تھے' جب ایک چھوٹے سے نالائق بھائی کا ''قتل'' میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ مجھے تم سے کوئی ہمدردی' کوئی اپنائیت نہیں رہی تھی۔''

مجھے یوں لگا' جیسے مجھے چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اُس کے چہرے' اُس کے لہجے اور اُس کے ایک ایک جملے سے نفرت' بے اعتنائی اور غیریت برس رہی تھی۔ وہ بالکل ایک مختلف روپ میں میرے سامنے تھی۔

''میں پلٹ کر تمہارے مکروہ ارادوں والی غلیظ صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔'' وہ نہایت بے رحمی سے کہہ رہی تھی۔

''مگر پھر میرے اندر کی انسان دوست اور خیر خواہ لڑکی کا ضمیر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ حق نواز شاہ نے تمہارے متعلق جو کچھ بتایا تھا' اسے سن کر میں اپنی نفرت پس پشت ڈال کر تمہاری زندگی بچانے کے لیے تمہاری مدد کرنے پر تیار ہو گئی اور وہ اس کے لیے کہ تم عمر کے جس حصے میں تھے' اس میں صحیح رہنمائی' ہمدردی اور اخلاص بھرے تعاون کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں انسان یا تو ساری زندگی کے لیے سدھر جاتا ہے یا پھر بگڑ جاتا ہے اور مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ اپنی ہری بھری عمر کر تباہ کرو۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کو زنگ آلود کرو اور خدا کی دی جائز نعمتوں سے منہ موڑ کے خود کو گناہ کے اس اندھے راستے پر ڈالو جہاں سے کوئی سلامت نہیں لوٹتا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اپنے گھر والوں کو روگ لگاؤ۔ اپنی جوانی داغ دار کرو اور اپنی ناکامیوں کا دوسروں سے انتقام لینے کی خاطر نفس زدگی کا اشتہار بنا کر رہ جاؤ۔ اپنے کزن انتصار صاحب کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ دولت اور نفس کی خواہش میں سلگنے والے ساری زندگی دل کے حقیقی سکون کے لیے ترستے رہتے ہیں کیا تم جانتے ہو انتصار صاحب کے کردار کی کجی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟''

''کس کا؟'' میں نے ہونق چہرہ لیے پوچھا۔

''ایک عورت کا۔'' اس نے نے بلند آواز میں کہا۔ ''انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں مجھے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ یونیورسٹی میں وہ اپنی ایک کلاس فیلو سے کمٹڈ ہو گئے مگر خاندانی جھگڑوں کے باعث انتصار صاحب اس کیس کو بڑوں تک پہنچانے کی جرأت نہ کر سکے۔ شادی نہ ہو سکی مگر زندگی کی پہلی ناکامی اور پہلی محبت کے غم نے انہیں دوسروں کے لیے بے حس' خود غرض اور چال باز بنا دیا۔ اس کے بعد غم غلط کرنے کے لیے وہ عورت اور شراب کے رسیا ہو گئے۔ تمہارے متعلق تمہارے دوست نے جو کچھ بتایا تھا' وہ بالکل اسی قسم کی دوسری کہانی کا نقطہ آغاز تھا۔ تم محبت ہار کے آئے تھے۔ گھر والوں سے بدظن تھے' یار دوست مدد کے لیے موجود نہ تھے۔ جیب خالی اور دماغ جذبات سے پر تھا مجھے خوف ہوا کہ تم گزارہ کرنے کے لیے اپنی جوانی بیچ کر خود کو شراب و کباب میں نہ اُلجھا لو۔ اتنی دور نہ چلے جاؤ کہ آواز بھی نہ پہنچ سکے۔ ایک ہی انتصار صاحب کافی ہیں' میں یہاں ایک اور انتصار صاحب کا روپ معاشرے میں چلتا پھرتا نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ اس لیے ایسی نوعیت آنے سے پہلے میں نے تمہیں سنبھالا دینے کا عہد کر لیا تھا۔ میرا مقصد تمہیں سنبھلنے کا اور موقع دینے کا تھا تا کہ کل کلاں کو تم تباہ ہو کر یہ نہ کہہ سکو کہ جب میں ڈوب رہا تھا تو کوئی مجھے بچانے والا نہیں تھا۔ اسی لیے تمہارے بدلے ہوئے رویوں کے باوجود درگزر سے کام لیتے ہوئے محض تمہارے اچھے مستقبل کے لیے میں نے اپنی انتقامی حس کو سلا دیا حالانکہ صدمہ بہت تھا مگر میں نے سوچا' اس عظیم ''نقصان'' پر ماتم کرنے کو تو عمر پڑی ہے۔ فی الحال تمہیں اس اقدام سے کسی طرح روک سکوں جس کے بعد تم قعر مذلت میں گر جاتے۔ گناہ کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے۔ میں نے طے کیا کہ جب تک تمہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا نہ دیکھ لوں' اپنے دل میں ہچکولے کھاتے نفرت اور انتقام کے ریلے کو چھپائے رہوں گی' تاوقتیکہ تم کسی قابل نہیں ہو جاتے۔ خدا کا شکر کہ میں اس میں کامیاب ہوئی۔ میں چند روز قبل تمہیں بتانے والی تھی مگر تم نے اپنی کمینگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم نفسانی خواہشات کے غلام ہو۔ آج میرا قیاس حرف بحرف یقین میں بدل گیا ہے اور اب میں سو فیصد یقین کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تم زندگی میں کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتے ماسوائے اپنے نفس کے۔ تم محض غرض کے کیڑے ہو۔''

اس کے لہجے کا تنفر' تحقیر' طنز اور زہریلا پن مجھے پانی پانی کیے دے رہا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ کوشش کے باوجود میں ایک لفظ بھی صفائی میں نہ کہہ پا رہا تھا۔

میری ایک بات لکھ کر رکھ لو تحریم کہ جوانی' طاقت' دولت' اور نام وری ہمیشہ ساتھ نہیں دیا کرتی اور اب ایک آخری بات تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں شاید یہ سوال ہو کہ اس دنیا میں لاکھوں غم کے مارے ناکام و نامراد لوگ دلِ محزوں لیے پھرتے ہیں' ہماری توجہ اور ہمدردی کے منتظر ہیں پھر میں نے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ نہ ہوتے ہوئے بھی تمہاری اتنی بڑی گستاخی نظر انداز کر کے تمہارے حالات سدھارنے میں مدد کیونکر کی۔"

وہ ایک لمحے کو رُک گئی۔ میری جھکی نظریں زمین پہ بکھرتے ہوئے خشک پتوں کو چھو رہی تھیں۔

"اگر آپ سمندر کے کنارے کھڑے ہوں جہاں دور و نزدیک بہت سے لوگ خودکشی کرنے کے لیے سمندر میں ڈوبنے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں تو اُن میں سے آپ کس کو بچائیں گے؟ سارے لوگوں کو تو نہیں بچا سکتے۔ ظاہر ہے' اُس کو بچانے کی کوشش کریں گے جو آپ سے کم سے کم فاصلے پر کھڑا ہوگا۔ باقیوں کے لیے آپ کے دل میں مدد کا جذبہ تو ضرور ہوگا مگر اس صورت حال میں آپ بے بس ہیں' اُن کے لیے دل میں افسوس اور تاسف محسوس کریں گے اور بچائیں گے اُسی کو جس کے قدم روکنا آپ کی دسترس میں ہوگا۔ میں نے بھی یہی کیا تھا۔ دنیا میں تمہارے جیسے سیکڑوں بلکہ ہزاروں لاکھوں نوجوان ہوں گے' اُن سب کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ ہے مگر چونکہ تم سے میرا براہ راست باضابطہ ٹاکرا ہوا تھا۔ تمہارا کیس میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا اس لیے میں نے سوچا' ان بہت سوں میں سے کسی ایک کو تباہی کے راستے پر جانے سے روک لوں۔"

پھر وہ کھڑی ہو گئی اور بلا کی سرد نظروں سے مجھے گھورتی ہوئی سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

"سنو تحریم۔ میں ضبط کی انتہاؤں پر ہوں۔ بہت برداشت کیا ہے مگر اب مزید کی تاب نہیں ہے۔ تم اب کبھی میرے سامنے مت آنا' مجھ سے رابطہ نہ کرنا ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔"

اُس کے دھیمے سلگتے ہوئے غیظ بھرے لہجے میں جانے کیا تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی پھیل گئی۔

"میں نے تمہارے ساتھ جو نیکی تھی' اس کا صلہ اپنے خدا سے مانگوں گی۔ میں نے کسی بھی صلے سے بے نیاز ہو کر تمہیں پستیوں میں گرنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پکڑا تھا۔ نیکی اگر صلے

کے لیے کی جائے تو پھر وہ نیکی نہیں رہتی' خود غرضی بن جاتی ہے۔ میں نے خالص اللہ کے لیے' انسانیت کے ناطے تمہارے ساتھ تعاون کیا تھا مگر شاید مجھ سے تمہیں سمجھنے میں غلطی ہو گئی۔ جاتے جاتے میری ایک بات سنتے جاؤ' بے وقوف انسان۔ زندگی میں ہمیشہ اس اصول کو یاد رکھنا کہ محبتیں حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ بانٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔"

مجھ سے انتہائی نفرت کے باوجود وہ حسب عادت جاتے جاتے بھی نصیحت کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ کتنا خیال تھا اُسے میرا۔ شاید میں ہی کم ظرف بن گیا تھا پھر وہ تیز تیز قدموں میں چلتی ہوئی بالآخر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔

♥♥♥

ہاں سنو دوستو!
جو بھی دنیا کہے' اُس کے پرکھے بنا مان لینا نہیں
ساری دنیا یہ کہتی ہے' پربت پہ چڑھنے کی نسبت اُترنا بہت سہل ہے۔
کس طرح مان لیں
تم نے دیکھا نہیں
سرفرازی کی دُھن میں کوئی آدمی
جب بلندی کے رستے پہ چلتا ہے تو
سانس تک ٹھیک کرنے کو رُکتا نہیں
اور اسی شخص کا
عمر کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے
پاؤں اٹھتا نہیں
اس لے دوستو' جو بھی دنیا کہے
اس کو پرکھے بنا مان لینا نہیں
ساری دنیا یہ کہتی ہے
اصل سفر تو مسافر کی آنکھوں میں پھیلا ہوا خواب ہے
کسطرح مان لیں

تم نے دیکھا نہیں' عمر کے اس سراب اجل خیز میں
خواب تو خواب ہیں
ہم کھلی آنکھ سے جو بھی کچھ دیکھتے ہیں
وہ ہوتا نہیں
راستے کے لیے راستے کی طرح۔
آدمی اپنے خوابوں کو بھی کاٹ دیتے ہیں لیکن
سلگتا ہوا راستہ
پھر بھی کٹتا نہیں
اس لیے دوستو
جو بھی دنیا کہے' اس کو پرکھے بنا
مان لینا نہیں

پچھلا بہت سارا بیتا ہوا وقت جیسے ایک سیریز میں میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ بہت ساری باتیں' بہت سارے جذبے، بہت سے رویے۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ بول رہا تھا۔

جب پہلی بار اس کی آواز سنی تھی پھر اس سے ملا۔ اس کو دیکھا۔ اس کے انداز کا غیر معمولی اعتماد اور مضبوطی مجھے بے طرح چونکا گئی تھی۔

پھر دوسری ملاقات میں اُس نے جس ہوشیاری سے میرے چہرے کے جارحانہ اور درست تاثرات پڑھ کر خوب صورتی سے جتایا تھا' اُس نے مجھے حیران کر دیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ مجھے سب سے زیادہ تنزیلہ رحمٰن سمجھ سکتی ہے۔ اس نے انتصار بھائی کی شخصیت کے بارے میں جس محتاط مگر پختہ انداز میں تبصرہ آرائی کی وہ مجھے بھی حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ آہستہ آہستہ میں اس کی نفیس عادات اور سادہ مگر پُر اعتماد اور مضبوط انداز و اطوار کا گرویدہ ہوتا گیا۔ اس سے برابر ہمکلام ہونے اور ربط ضبط بڑھانے کی خواہش بیدار ہوتی گئی جسے میں اس تک پہنچایا تو اُس نے دوٹوک انداز میں مرد، عورت کی دوستی کے پس پردہ کھیلے جانے والے کھیل کے بارے میں بتا کر جتلایا کہ وہ بھائی کا رشتہ بہرحال قبول کر سکتی ہے۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں نے تنزیلہ کے توجہ دلانے پر اس پہلو سے سوچا تھا ورنہ سچی بات یہ تھی کہ اُسے بہن بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس سمت میرا

دھیان نہیں گیا تھا۔ میں بس اُس سے سلام دعا' آشنائی اور ہلکی پھلکی دوستانہ اپنائیت بھری وابستگی چاہتا تھا۔ اس نے بھائی کا رشتہ استوار کرنے کا عندیہ دیا تو میں نے بلا سوچے سمجھے اسے قبول کرلیا کہ مجھے اس کی پرخلوص رفاقت درکار تھی' چاہے وہ کسی روپ میں بھی ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اُس کے ہمدردانہ' مخلص اور شگفتہ لب و لہجے کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس کی ہر ادا مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی بظاہر عام سی شخصیت کی چھوٹی چھوٹی خوب صورت رمزیں بڑی دلچسپ محسوس ہوتی تھیں۔

بارہا اس کا متبسم' تروتازہ' شرمیلا اور کبھی خفگی بھرا روپ غیر اردی طور پر اُس کی غیر موجودگی میں میرے ذہن میں جگمگاتا رہتا تھا۔ جس قدر میں نے اس کی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلوؤں سے آگاہی حاصل کی تھی' اتنی تو شاید تنزیلہ رحمٰن کے بارے میں تصور کرتے ہوئے مجھے اس کے حسن و شباب اور والہانہ محبتوں کے مخمور ناز و ادا کے ماسوا کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ اس کی جسمانی کشش مجھے تڑپاتی تھی۔

مگر تنزیلہ اکرام کی رفاقت میں گزرا ایک ایک شانت لمحہ مجھے بے چین کیے رکھتا تھا۔ آج احساس ہو رہا تھا کہ میں سچ مچ اُس کا اسیر ہو گیا ہوں۔ وہ بڑی شان سے میرے خیالوں' خوابوں اور تصورات میں براجمان ہو گئی ہے۔ میں اُس کے طلسم کا قائل ہو گیا تھا اور اب لگتا تھا' جیسے کہیں بھی نہ جاسکوں گا۔ وہ جیسے میری روح کی بیساکھی بن چکی تھی۔ میں چاہتا بھی تو اُس کے سحر سے رہائی نہ پاسکتا تھا۔

بے ساختہ مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔ جو یقیناً حسب حال ہی تھا۔

اس کی مٹھی میں بہت زور رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

اگر دیکھا جائے تو ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں کوئی وعدہ' کوئی اقرار نہیں ہوا تھا۔ ہم دونوں کے راستے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ کوئی کمٹ منٹ نہیں تھی جو زنجیر پا بنتی۔ دیکھا جائے تو مجھے اپنی تنہائی اپنی زندگی پر پورا تصرف تھا۔ مگر جانے کیوں اس روز اس نے کبھی نہ ملنے کا حکم دے کر راستہ بدلا تو مجھے یوں لگا' جیسے اس نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہو۔ جیسے اس نے مجھے سزائے موت سنادی ہو۔

کتنے برس بیت گئے۔ یہ جاننے میں
کہ میرے اندر تیرا ہونا کیا ہے
شام ہوتے ہی
چاند میں روشنی نہیں آجاتی
رات ہوتے ہی
رات کی رانی مہک نہیں اُٹھتی
شام اور روشنی کے بیچ
رات اور خوشبو کے بیچ
ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے
جس کا ہماری زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا
اس آسمانی لمحے نے
اب مجھے چھو لیا ہے

''تو پھر وہ کیا تھا جو میرے اور تنزیلہ رحمٰن کے درمیان تھا؟'' میرے اندر سے صدا اُبھری۔

''کیا واقعی وہ کم عمری کی جذباتیت تھی۔ سطحی محبت تھی۔ آنکھوں' ہونٹوں' رخسا اور گداز بدن کی خوبصورتیوں سے متاثر ہو کر جانے والی محبت کا نام دے ڈالا؟'' میں اپنے آپ کو ٹٹول رہا تھا۔

تنزیلہ رحمٰن کی خود سپردگی نے وہ جذبہ میرے اندر جگایا تھا مگر یہاں تنزیلہ اکرام کے معاملے میں یہ جذبہ خود بخود بے ساختہ' بتدریج میرے اندر پھوٹ پڑا تھا۔ اس میں تنزیلہ اکرام کی حوصلہ افزائی شامل نہیں تھی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ اتنے موسم بیت جانے کے بعد تنزیلہ رحمٰن کو پا لینے کی مکمل یقین دہانی کے باوجود میرے اندر کا جمود نہیں ٹوٹا تھا۔ میں تنزیلہ رحمٰن سے ملا تو بہت نارمل بلکہ فارمل انداز میں ملا تھا۔ اُسے دیکھ کر پہلے کی طرح دل کی دھڑکنیں تیز نہیں ہوئیں۔ اُسے چھونے' اسے محسوس کرنے کا خوش کن خیال بیدار نہیں ہوا تھا۔ لہجے اور آواز و انداز کے رنگ بدل گئے تھے۔ ذہن تو وہی تھی مگر اب دل ہم آہنگ نہیں رہے تھے۔ دھڑکنوں کے انداز بدل گئے تھے۔ جذبوں کا رخ بدل گیا تھا۔

مگر کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے۔ مجھے سیما آپا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''دل بدلتے ہیں تو جذبے بھی بدل جاتے ہیں۔''

♥ ♥ ♥

"کیا چاہتے ہو مجھ سے تم۔ کیوں کرتے ہو بار بار فون؟"
اُس کے لہجے میں بلا کی ترشی اور سرد مہری تھی۔ جیسے وہ ضبط کی آخری سرحدوں پر تھی۔

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار کہیں بیٹھ کر میری بات سن لیجیے۔ پلیز۔" میں لجاجت سے بول پڑا۔ پہلے چند روز تو وہ میری آواز سن کر کچھ کہے بغیر فون رکھ دیتی تھی، آج تنگ آ کر بات کرنے آمادہ ہو گئی اور میں یہ سنہری موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لیے جلدی جلدی بولتا چلا گیا۔

"صرف ایک بار۔ آپ مجھے کچھ کہنے کا موقع دے دیں۔ میں سب کچھ بتا دوں گا آپ کو۔"

"کیا ابھی کچھ کسر رہتی ہے؟" اس کا زہر میں بجھا انداز میرے دل میں کانٹے کی طرح اُتر گیا۔ میں ایک لمحے کو چپ سا رہ گیا۔

"میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ بہت پریشان ہوں۔ آپ کا دل دکھانے کی بہت کڑی سزا بھگت رہا ہوں۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ ہر شخص کو اپنا بھگتان خود بھگتنا پڑتا ہے۔" وہ کٹھور لہجے میں بولی اور کوئی موقع ہوتا تو میری پریشانی کا سن کر وہ بری طرح بے چین ہو جاتی مگر اب اُس کے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"جہاں تک معافی کا تعلق ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ ایک دفعہ تمہیں معاف کر کے تم سے جو انتقام لیا ہے، یہ مرتے دم تک...... تمہاری ذات کا رواں رواں یاد رکھے گا۔ میں نے تو آگ

کا دریا پار کر لیا ہے، اذیت کے صحرا میں بہت خاک چھان لی، اب تمہاری باری ہے۔"
وہ حد درجہ سفاکی سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے میری روح پہ جو زخم لگائے ہیں، اس کا مداوا تمہاری بے تاثیر معذرتوں سے کہاں ممکن ہے۔ تم نے میری معصومیت کو، میری سادگی کو، میری روح کی شفافیت اور میرے جذبوں کی بے ساختگی کو مجروح کیا ہے۔ منہ بولے بھائی کے روپ میں تم نے جس طرح مجھے ڈسا ہے، اس زہر کا کچھ ذائقہ تم بھی چکھو اب۔ تم بھی تو سلگ کے دیکھو اس آگ میں۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ پہلی بار تمہیں دل سے معاف نہیں کیا تھا۔ محض خول چڑھایا تھا، اپنی نفرت پر ہمدردی کا۔ محض انسانیت کی فلاح کے لیے ایک بھٹکتے ہوئے نوجوان کو راستہ دکھانے کے لیے۔ اب احساس ہوا ہے، اپنی غلطی کا کہ بھلائی تو انسان کے ساتھ کی جاتی ہے۔ حیوانی سطح پر جذبات کا کاروبار کرنے والوں کے ساتھ نہیں۔ سچ کہا ہے، فرائیڈ نے کہ انسانی شخصیت کی تعریف جنس اور جارحیت سے متعلق رویوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان رویوں کی شدتیں ہی انسان اور حیوان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہیں۔ ان میں مناسب توازن رہے تو انسان انسان رہتا ہے اور اگر انتہا کو چھو لے تو حیوانیت کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔"

"تنزیلہ۔ میں آپ کو کیونکر بتاؤں کہ اب کی بار میں نے مکمل خلوص، اور محبت کے ساتھ آپ کا ساتھ چاہا تھا۔ پہلی بار ضرور بہکا تھا مگر اُس دن کے سچ سچ آپ کے لیے مرے دل میں یہ جذبہ جاگ پڑا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی خود کو روکنے کی مگر بے بس رہا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا، میں خود بخود آپ کا اسیر ہوتا گیا۔"

"شرم کرو۔" وہ بلا کے تلخ انداز میں لتاڑتے ہوئے خشک لہجے میں بولی۔ "اپنی اور میری عمر کے درمیان فرق دیکھا ہے؟ تمہیں ذرا حیا نہیں آ رہی اس رح کے ڈائیلاگ بولتے ہوئے۔ کس قدر "ہلکے" کردار کے مالک ہو۔ جس عورت کو کبھی بہن کا درجہ دیا تھا، اب اُس سے اس قدر ڈھٹائی سے رومانس جھاڑ رہے ہو؟" وہ دانت پیس کر بولی۔

"آپ میری سگی بہن تو نہیں ہیں ناں اور یہ ایک حقیقت ہے۔ منہ بولا رشتہ نئے رشتے میں

بھی تو بدل سکتا ہے۔" میں نے کمزور لہجے میں دلیل دینا چاہی۔

"یہ بات تمہیں رشتہ جوڑتے ہوئے سوچنا چاہیے تھی۔ جس رشتے کو نبھا نہیں سکتے تھے اس کو بنایا کیوں تھا۔"

"اُس وقت مجھے اپنے جذبوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا مگر اب۔ پلیز تنزیلہ ایک لمحے کو سوچئے۔ آپ بھی تو تنہا ہیں۔ اتنی لمبی عمر کیسے گزاریں گی بغیر کسی ساتھ کے۔" میں نے اُس کا دھیان دوسرے پہلو کی سمت بنانا چاہا۔

"تم یوں نہیں سمجھتے بے وقوف آدمی۔" وہ زچ سی ہو گئی۔

"محبت دو طرفہ جذبہ ہوتی ہے۔ وہ دلوں کے درمیان بیدار ہوتی ہے۔ یہ یک طرفہ جذبات پر مشتمل نہیں ... ایک بے ساختہ جذبہ ہے۔ خود بخود پھوٹتا ہے اور میرے دل میں اس کا بوٹا نہیں ... میں بھلا تمہیں کیسے وہ مقام دے سکتی ہوں جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں" اب کے وہ قدرے نرم پڑ گئی تھی۔

"تم خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ میرے اندر آگ بھڑک رہی ہے۔ میرے مقابل آئے تو تم جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔" یکا یک اُس کے انداز میں بلا کی بے رحمی در آئی۔

"میں بڑے کرب میں ہوں۔ بہت بری طرح لوٹا ہے تم نے میرے جذبوں کو۔ بہت اذیت پہنچائی ہے"

"میں اسی کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "آپ کا دل دکھا کر میں نے جو جرم کیا ہے اس کی آپ سے اور خدا سے معافی چاہتا ہوں۔"

"تم خدا سے معافی طلب کرو۔ اس سے رجوع کرو۔ وہی نوازے گا تمہیں۔"

"وہ بھی تو اس طرح معاف نہیں کرتا۔ وہ اپنے حقوق کی حق تلفی پر تو معافی دے سکتا ہے مگر جو لوگ مخلوق خدا کو ستاتے ہیں ہیں انہیں اُس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ وہ بندہ انہیں

معاف نہ کر دے۔ آپ معاف کر دیں گی تو خدا بھی معاف کر دے گا۔"

"میرے دل میں تمہارے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔" اس نے قطعیت سے دوٹوک کہا۔

"کبھی تھی، بہت چاہت تھی تمہارے لیے۔ مگر اب کچھ نہیں رہا۔ ایک بات کا تمہیں چیلنج دیتی ہوں، جتنا میں نے تم پر خلوص نچھاور کیا ہے اس سے زیادہ کہیں سے پالو تو ضرور بتانا۔"

"پلیز۔ تھوڑی سی گنجائش پیدا کر لیں۔ پلیز......"

"جب کوئی چیز اپنے مرکز سے ہٹ جائے تو بہت سی خرابیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ تعلقات بھی اپنے بنیادی نقطہ آغاز سے ہٹ جائیں تو ربط میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔"

آج محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کا "کھونا" کیا معنی رکھتا ہے۔

جب تک پیٹ بھرا رہتا ہے، طلب بھی بیدار نہیں ہوتی۔ ملتا رہے تو تشنگی کا احساس ... تا۔ یہ کھو کر پتا چلتا ہے کہ کتنی بڑی بازی ہار دی ہے۔

آج پتا چلا تھا کہ جس کو ایک عمر چاہنے کے بلند بانگ دعوے کرتا رہا اس کے لیے جنوں رتیں بدل چکی ہیں۔ اب دل ٹھہر گیا ہے۔ بے قراریاں مٹ گئی ہیں۔ تشنگی کا احساس جاتا رہا ہے۔ اور جس کے ساتھ محض ہمدردی اور خلوص کا تعلق تھا اُس کی طلب جڑوں میں بیٹھ گئی ہے۔

ہم دونوں کے بیچ میں حائل ساگر تھا تنہائی کا
میں بھی ایک جزیرہ ہوں اور بھی ایک جزیرہ تھی
وقت بدل جائے تو صہبا وقت کو بدلے آخر کون
اب وہ میر اسناٹا ہے، کل جو میرا نغمہ تھی

"مجھ سے دوبارہ رابطہ مت کرنا۔ میرے پاس تمہارے لیے انکار اور تحقیر تنفر کے انگاروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" اُس کا لہجہ بالکل خشک تھا۔

"میں نے تم سے اب کسی قسم کا ربط استوار نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے تمہیں صرف

یک بھائی کے روپ میں دل میں جگہ دی تھی مگر یہ مقام تمہیں راس نہیں آیا۔ تمہارے نزدیک منہ بولے رشتوں کا بیوپار ممکن ہوگا مگر میرے نزدیک ایسا سوچنا بھی کراہیت آمیز ہے۔ میں تمہاری اب کچھ نہیں ہوں۔'' اس نے فون رکھ دیا تھا۔

تجھ سے مل کر تو یہ محسوس ہوا اے اجنبی دوست
تو میری پہلی محبت تھی میری آخری دوست

کتنی عجیب بات تھی، تنزیلہ رحمٰن کے ساتھ بیتے وقت کے لمحوں کی یاد کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی اور تنزیلہ اکرام کے ساتھ گزرا ایک ایک پل ذہن کی اسکرین پہ روشن تھا۔

عذاب دھوپ کے کیسے ہیں بارشیں کیا ہیں
فصیل جسم گری جب تو ہوش آیا ہے
میں کیا کروں گا اگر وہ نہ مل سکا امجد
ابھی ابھی میرے دل میں خیال آیا

♥♥♥

''ارے، تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ تمہاری دلہن انتظار میں ہوگی۔ دیکھو تو تین بج رہے ہیں۔ کمال ہے۔ تمہیں تو بہت جلدی ہونا چاہیے تھی، تنزیلہ سے شب زفاف میں ملنے کی۔'' ثریا بھابی مجھے تلاش کرتی ہوئی لان میں آئی تھیں۔ جہاں ہر طرف لائٹوں کی جگمگاہٹ تھی۔

''آج میری شادی تھی۔ تحریم اختر کی شادی۔ اُس کی محبوبہ تنزیلہ رحمٰن کے ساتھ۔'' میں استہزائیہ انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں اپنے گھر لاہور میں تھا جہاں میرا کمرا حجلہ عروسی کے تمام تر لوازمات سے سجا دیا گیا تھا۔

''جاتا ہوں بھابی۔'' میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا'' تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔ اندر گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔''

میں سوچوں کے دائرے میں مسلسل چکراتے ہوئے تھک چلا تھا۔

''فکر نہیں کرو۔ تنزیلہ کی ایک جھلک ساری گھٹن بھگا دے گی۔ ماشاء اللہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ اب ہمیں کوئی گلہ نہیں رہا تمہاری کشور دکہ کا۔ لڑکی واقعی ہیرا ہے۔ اس کے لیے تو ولی بھی بن باس لے سکتا ہے۔''

وہ بڑے لطیف انداز میں اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ کے ذریعے میرا موڈ بحال کرنا چاہ رہی تھیں مگر میرے چہرے پر مسکراہٹ کی رمق نہیں جاگی تھی۔

جس لڑکی کی شان میں وہ قصیدے پڑھ رہی تھیں، اپس کے ماورائی حسن سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ نگاہ میں کسی اور کا جمال ٹھہر گیا تھا۔

اُن کے سوالوں سے بچنے کے لیے میں بالآخر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرے بیڈ کے بیچوں بیچ وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت میری منتظر بیٹھی تھی۔

میں صوفے پر براجمان ہوگیا اور بے حس وحرکت بیٹھا سپاٹ مگر گہری نظر سے اُس کے شعلہ سے حسن کا جائزہ لینے لگا۔

حیرت کی بات تھی' میرے اندر کا نفس پرست مرد اتنے قیامت خیز نظاروں کے باوجود بیدار ہونے کو آمادہ نہیں ہوا۔

میں جو اُس کے ہونٹوں' آنکھوں اور گلاب رخساروں پہ فدا تھا' اس کے شباب کے جوبن پہ دل تھام کے رہ جاتا تھا' اب وہ سب کچھ میری ملکیت میں تھا۔ میری دسترس میں تھا۔ میرے سامنے تھا مگر میرے دل کے بے تاب جذبے کہیں جا سوئے تھے۔ جاگ کے نہیں دے رہے تھے۔

''تم تھک گئی ہوگی۔ کپڑے بدل کے آرام کرو۔'' میں آہستگی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر چینج کر کے بیڈ کے دوسرے کنارے پہ موجود وجود کو نظر انداز کرتے ہوئے لائٹ آف کر کے بستر پر گر گیا۔

♥♥♥

''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے!'' اُس روز وہ اُلجھے ہوئے سراسیمہ انداز میں دھیمے سے پوچھ ہی بیٹھی۔

''میں نے کب کہا۔'' میں پینٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈال کر سادہ لہجے میں بولا۔

''تو پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں میرے ساتھ۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''کیسا۔'' میں نے لب بھینچ کر اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر سر جھکا گئی۔ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔ تب میں نے ایک گہرا سانس سینے سے آزاد کیا۔ میں اُس کا مطالبہ سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ خبر نہیں کیوں دل کا ہر جذبہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ جو وہ مجھ سے چاہتی تھی' میں اُسے دینے سے قاصر تھا۔ میرا دل ہی نہیں جاتا تھا اس طرف۔

وہ چپ چاپ میرے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ شکست خوردہ سی' افسردہ اور مایوس سی۔ میں بے حسی سے باہر نکل گیا۔ وہ جس کے ایک آنسو پر میں تڑپ تڑپ جاتا تھا' وہ ساری ساری رات آنسو بہاتی تھی اور میرے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔

تُو بھی کچھ اور اور ہے' ہم بھی کچھ اور اور ہیں
جانے وہ تو کدھر گیا' جانے وہ ہم کدھر گئے
کوئی کنار آبجو بیٹھا ہوا ہے سرنگوں
کشتی کدھر چلی گئی جانے کدھر بھنور گئے

وقت کتنا بدل گیا تھا اور اس بدلتے وقت نے جذبوں کا رخ کس شدت سے بدل ڈالا تھا۔

مجھے تم یاد آتے ہو
کسی سنسان سینے میں چھپی خواہش کی صورت میں

کسی مصروفیت کے موڑ پر
تنہائی کے صحراؤں میں
یا پھر کسی انجان بیماری کی شدت میں
کسی بچھڑے ہوئے کی چشمِ پرنم کے نظارے پر
کسی بیتے ہوئے دن کی تھکن کی اوٹ سے
یا پھر تمہارے ذکر میں گزری ہوئی شب کے اشارے پر
کسی بستی کی بارونق سڑک پر
اور کسی دریا' کسی ویران جنگل کے کنارے پر
مجھے تم یاد آتے ہو۔
مری چپ کے کنویں میں
آرزوؤں کے بدن جب تیرتے ہیں
اور کنارے سے کوئی بولے
تو لگتا ہے اجل آواز دیتی ہے
مری بے چینیوں میں جب تمہاری تندخو رنجش کھٹکتی ہے
تمہاری بے سبب دوری سلگتی ہے
یا پھر جب بھی مری آنکھوں کے صحرا میں
تمہاری یاد کی تصویر جلتی ہے
جدائی ہاتھ ملتی ہے
مجھے تم یاد آتے ہو۔
مقدر کے ستاروں پر
زمانوں کے اشاروں پر
اُداسی کے کناروں پر
کبھی ویران شہروں میں
کبھی سنسان رستوں پر

کبھی حیران آنکھوں میں
کبھی بے جان لمحوں پر
مجھے تم یاد آتے ہو
سہانی شام ہو کوئی
بھلے گلفام ہو کوئی
کسی کے نام ہو کوئی
مجھے تم یاد آتے ہو
کہیں بارش برس جائے
کہیں صحرا ترس جائے
کہیں کالی گھٹا اُترے
کہیں بادِ صبا ٹھہرے
تمہارے اور میرے درمیاں آ کر خدا ٹھہرے
تو میری زندگی کے اول و آخر
تم اس لمحے خدا کے بعد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو

یا الٰہی! کیا واقعی پا لینا دراصل گنوا دینا ہوتا ہے! کسی کو پا کر جنوں کی تمام رتیں مرجھا جاتی ہیں۔ بے ساختگیاں انجماد پذیر ہو جاتی ہیں۔ نہ پانے کی بھی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔

میرا دل چاہتا تھا' چیخ چیخ کر ساری دنیا کے نوجوانوں کو جمع کر لوں اور پھر انہیں بتاؤں۔ انہیں آگاہ کروں کہ چہرے کی کشش سے بیدار ہونے والے جذبے کو محبت کا نام دے کر اسے پانے کی سعی نہ کرو۔ خوب صورت آنکھوں' بالوں اور چہرے کا خمار جب اترتا ہے تو باقی کچھ بھی نہیں رہتا جسم تسکین حاصل کر لیتا ہے تو محبوب کے سراپے کی ساری خوب صورتیاں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ خوب صورت شکل کو دیکھ کر ابھرنے والا جذبہ دراصل وقتی انسپائریشن اور عارضی اٹریکشن ہوتی ہے جسے ہم محبت کا نام دے دیتے ہیں حالانکہ وہ محبت نہیں ہوتی بلکہ ایک نارمل سا فطری رویہ ہوتا ہے کہ جہاں بھی نظر آئے' انسانی فطرت کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ جیسا کہ خوب

صورت نظارے ہماری توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ پیارے پیارے لال گلابی گال گوتھنے بچوں پہ پیار آتا ہے حسین پینٹنگ دیکھ کر انسان مبہوت رہ جاتا ہے۔ فن کاری کا کوئی نادر و دلکش نمونہ یا ڈیزائن ہمیں کشید کرتا ہے لیکن ہم ان نظاروں کو، بچوں کو یا فن پاروں کو اُٹھا کے گھر تو نہیں لے آتے یا ان پر قبضہ جمانے اور ہمیشہ کے لیے اپنے نام کرنے کی بے وقوفانہ خواہش تو نہیں رکھتے۔

اسی طرح خوب صورت لڑکی یا لڑکے پر غیر ارادی طور پر ایک ماہ بعد دوسری نظر پڑ جاتی ہے۔ بسا اوقات اسے ٹکٹکی باندھ کر جی بھر کے دیکھنے کی تمنا بیدار ہوتی ہے۔ خوب صورتی سے متاثر ہونے اور متوجہ ہونے کا یہ جذبہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ غلطی ہم وہاں کرتے ہیں، جب اس وقت جذبے کو محبت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جیسا کہ میں سمجھ بیٹھا تھا۔

ایسی محبتیں واقعتاً دودھ کا ابال ہی ثابت ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔

تنزیلہ رحمٰن سے میں نے کبھی بھی محبت نہیں کی تھی۔ یا کم از کم اُس کی روح سے محبت نہیں تھی مجھے۔ میں نے اُس کی خوب صورتی سے محبت کی تھی۔ اس کی ظاہری رعنائیوں کو پانا چاہا تھا۔ اس کے "باہر" پر قابض ہونے کی تمنا کی تھی۔ اس کے "اندر" کو پانا تو درکنار کبھی وہاں جھانکنے کی بھی زحمت نہ کی تھی اور شاید اُس کے اندر کچھ تھا بھی نہیں۔ جبھی تو اُس کے "بیرونی طلسم" سے میں اتنی جلدی آزاد ہو گیا تھا۔

شاعر نے ایویں تو نہیں کیا

سیرت نہ ہو تو عارض ورخسار سب غلط
خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

اور تنزیلہ اکرام کے "اندر" نے مجھے مسحور کیا تھا۔ ایک دم نہیں۔

آہستہ آہستہ۔ دھیرے دھیرے، بتدریج

چونکہ یہ "پراسس" بتدریج ہوا تھا اس لیے اس کا "اثر" دیرپا بھی تھا۔

تنزیلہ رحمٰن کے لیے جنون اچانک اُبھرا تھا اسی لیے اچانک اُتر بھی گیا تھا۔

میرا ساحر تو وہ تھا جو موجود نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنے طلسم میں گرفتار کیے ہوئے تھا۔

اس کی باتیں، اس کی ادائیں، اس کی شخصیت کا شگفتہ و شائستہ انداز۔ اس کے اقوال، اس کے

اعمال۔ اس کی ذات کا ایک ایک رنگ مجھ میں سما گیا تھا۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا اور میں غیر شعوری طور پر اندر سے "مصفا" ہوتا چلا گیا۔ اس نے بڑے غیر محسوس انداز میں میرے "اندر" کے "گند" کی صفائی کی تھی۔ میری نفس زدہ آلودہ سوچوں کو پاکیزگی کا جامہ پہنایا تھا۔

میری جنسی آوارگی میں لتھڑے سطحی جذبات کا صفایا کر کے مثبت اور بامقصد تعمیری تحریک پیدا کی تھی۔

میں واقعی غلط تھا

اس کا احساس مجھے اب ہوا تھا۔

خود غرضی، ہوس پرستی اور عیش و عشرت ۔ یہ تینوں اجزا مل کر میری شخصیت کی Definition بناتے تھے۔

اور تنزیلہ اکرام نے مجھے بنا دیا تھا۔

ان تینوں اجزا کو میری شخصیت سے خارج کر کے میرا اندر "دھو" ڈالا تھا۔

مجھے زندگی کا صحیح رُخ دکھایا تھا۔

انسانیت کا، فلاح کا، سچائی کا راستہ دکھایا تھا۔

یہ درس دیا تھا کہ صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے جینا اور اُن کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرنے میں عار محسوس نہ کرنا بڑی حیوانیت ہے۔

ہم انسان ہیں۔ اشرف المخلوقات ہیں اور ہمیں یہ حیوانیت زیب نہیں دیتی۔

اگر تنزیلہ اکرام میری زندگی میں نہ آتی تو میں ہوس زن اور ہوس زر کے نشے میں وحشت ہو کر اپنا آپ تباہ کر لیتا تھا۔ اب تک تو میں ختم ہو چکا ہوتا کہ جنسی غلاظتوں اور آلائشوں میں اپنی جوانی برباد کرنے والوں کی عمریں خود بخود اُن کے کرتوتوں کی بدولت گھٹ جاتی ہیں۔ وہ اپنی بھیانک تباہی اور عبرت ناک موت کا سامان خود تیار کرتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی یہی ہونا تھا۔

مگر مجھے بروقت ایک مہربان ہاتھ نے سنبھال لیا تھا۔

ایک ساحر نے مجھ پہ طلسم پھونک کر اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

میں اب اس سحر سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

تاعمر اس کی مٹھی میں رہنا چاہتا تھا۔

لیکن آزاد کر دینے کے باوجود میں اس کے سحر سے رہائی نہیں پا سکا۔

میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔

"اگر مجھے اپنی مٹھی کی اماں نہیں دینا چاہتی ہو تو اپنے سحر سے رہائی کیوں نہیں دیتی ہو۔" میں بے بسی سے اسے تنہائی میں پکارتا تھا۔

میں آزاد ہونا چاہوں بھی تو تمہارے طلسم سے آزاد نہیں ہو پاتا۔

تم نے مجھے اس طرح اپنا اسیر بنایا ہے کہ کسی اور طرف نگاہ ڈالنے کی اجازت ہی نہیں ملتی ہے۔

میری شادی کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔

چھ ماہ!

اور کیا آپ یقین کریں گے کہ وہی تنزیلہ رحمٰن جس کو پانے کے لیے میں [illegible]یا تیاگ دی تھی' وہ چھ ماہ سے دن رات میری دسترس میں تھی۔ میری ملکیت بن چکی تھی مگر م[illegible] نے اُسے چھونا تو درکنار استحقاق کی ایک نگاہ بھی نہ ڈالی تھی اُس پر۔

کیا دیوانگی تھی۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا' دنیا والوں کی نظروں میں۔

میں ایاز بھائی کے ساتھ کامیابی سے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سنبھال رہا تھا۔ ابا جان خوش تھے کہ میری شمولیت سے پہلے سے دگنا منافع ہو رہا ہے۔ گھر میں بڑی ذمے داری اور سمجھ داری سے خانگی معاملات میں حصہ لیا تھا۔

بی بی جان میری سلجھی ہوئی متین روش پر بہت خوش تھیں۔ ثریا بھابی' سرفراز بھائی' آپا اور گھر کے دیگر افراد کے ساتھ میرا رویہ بڑا مثبت تھا۔ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ رہی تھی۔ سب کے سامنے تنزیلہ کے ساتھ بھی بڑی اپنائیت سے پیش آتا تھا۔ اُس کا باپ بھی اب مجھے بحیثیت ایک داماد کے پورا "پروٹوکول" دیتا تھا۔

کسی کو میری وجہ سے یا میری طرف سے کوئی پریشانی نہ رہی تھی۔

وہ لوگ سمجھ رہے تھے' میں نے جوگ ترک کر کے اب حقیقی معنوں میں زندگی میں قدم رکھا ہے۔

مگر بھولے لوگ۔ مجھے ہنسی آجاتی تھی' کبھی اس بات پر۔

وہ کیا جانیں۔

جوگ صرف یہی نہیں ہوتا کہ عالم جنون میں گھر چھوڑ کے باہر جنگلوں میں جا بسو یا دنیا سے کنارہ کشی کر لو۔ بعض اوقات انسان دوسروں کے درمیان رہتے ہوئے دنیا داری کے تمام تر تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے وجود کا مثبت احساس دلانے کے باوجود بھی "اندر" سے "حالت جوگ" میں ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں' یہ جوگ زیادہ کٹھن اور صبر طلب ہوتا ہے۔ جیسے سب کے درمیان گم ہو جانا۔

تنزیلہ رحمٰن کے لیے "ظاہری جوگ" لیا تھا' سو اس کے تقاضے پورے کرتے ہوئے دربدر ہوا تھا جس کا سب کو علم تھا کہ سب کے سامنے ہوا تھا۔

اور تنزیلہ اکرام کے لیے "باطنی جوگ" لے رکھا تھا جس کا علم صرف مجھے تھا اور کسی کو خبر نہیں تھی۔

حتیٰ کہ خود تنزیلہ اکرام کو بھی نہیں۔

♥♥♥

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

ہوں۔ تو یہ تھا' پوری کہانی کا نچوڑ۔ سارے فسانے کا اصل کردار۔ بات کا حقیقی پہلو'' میں نے ''رحمٰن'' والوں کا موٹا سا' قدرے بوسیدہ صفحات والا رجسٹر ہلکی سی آواز کے ساتھ اچانک بند کر کے میز پر ڈال دیا تھا۔ یہی وہ رجسٹر تھا جسے کچھ سال پہلے تحریم لاہور سے روانہ ہوتے وقت ہمراہ لے کر گیا تھا اور بعد میں اسے ڈائری کے طور پر استعمال کرنے لگا تھا۔

اس پر اُس کے اسلام آباد میں قیام کے دوران پیش آنے والے تمام تر واقعات کی تفصیل درج تھی۔

رات کے دو بج رہے تھے مگر میں ہنوز اس رجسٹر کے ''سحر'' میں گم تھی۔

اچانک۔ بہت اچانک شادی کے چھ سات ماہ گزر جانے کے بعد مجھے تحریم کی سمجھ میں نہ آنے والی بے رخی کا اصل سبب معلوم ہوا تھا۔ الماری سیٹ کرتے ہوئے اتفاقاً تحریم کے ہاتھ کا لکھا یہ رجسٹر مجھے ملا تھا۔

اسی سے ساری داستان سامنے آئی تھی۔

''قارئین! اس سے پہلے کہ آپ ایک نووارد کے کہانی میں گھس آنے کے خلاف احتجاج کریں' میں آپ سے اپنا تعارف کرائے دیتی ہوں۔ اس کے بعد آپ کو یقین آجائے گا کہ بیشک میں اس سارے قصے میں بہت کم منظر عام پر آئی ہوں مگر اس کے باوجود کہانی میری ہی گرد گھومتی رہی ہے۔

جب ہم نہ تھے' تب بھی تو ہم آئے تھے۔

جی ہاں! میں تنزیلہ رحمٰن ہوں۔ نہیں بلکہ غلط کہا تنزیلہ تحریم اختر!

تحریم کی بیوی اور ''سابقہ'' محبوبہ۔

''سابقہ'' اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں اب اُس کو محبوب نہیں رہی۔ اُس کی محبوبہ جب تک

تھی' جب تنزیلہ رحمٰن ہوا کرتی تھی۔

یا کم از کم اس خوش فہمی میں ضرور مبتلا ہوں تھی کہ تحریم اختر مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ میرے حسن جہاں سوز کا دیوانہ ہے۔ وہ ہمیشہ میرا رہے گا۔

تحریم اختر کے کردار کی کجی' خامی اور اس کی وجوہات تو سامنے آگئیں' تنزیلہ اکرام کی شخصیت کی گرہ بھی کھل گئی مگر میرے بارے میں یقیناً ابھی آپ لوگ ابہام کا شکار ہوں گے۔

کچھ کی نگاہ میں میرا کردار کم وبیش ماہرہ سے ملتا جلتا ہے۔

کچھ کی نگاہ میں خوش نصیب ترین لڑکی ہوں کہ جس کو کوئی جنون کی حد تک چاہتا ہے۔

کچھ کو میری باکی کھٹکی ہوگی اور کچھ نے ان شوخیوں کو حسن کی ادا سمجھ کر صرف نظر کیا ہوگا۔

مگر میں آپ کو بالکل حقیقت بتا رہی ہوں۔ یہ اعتراف کر رہی ہوں کہ میں بھی ایک کمزور ارادوں کی مالک' نفس پرست لڑکی ہوں یا کم از کم اب تک تو تھی۔ میری سوچ بڑی سطحی اور عامیانہ تھی۔

بچپن سے جوانی تک یہی احساس وادراک ملا کہ میں بے پناہ حسین ہوں۔ سو میری ہر سوچ کا سرا چاہنے' سراہے جانے اور حسن کا خراج وصول کرنے کی بازاری خواہش سے جا ملتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مردوں کی مردانگی کو جی بھر کے آزماؤں۔ اُن کے سامنے اپنے حسن وشباب کے جلوے بکھیروں اور پھر انہیں پگھلتا' تڑپتا' جلتا اور راکھ ہوتا ہوا دیکھوں۔

آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔

صرف عورت کا غیر معمولی حسن ہی مرد کی آزمائش نہیں ہوتا' غیر معمولی طور پر حسین مرد بھی عورت کے نفس اور ضبط کی آزمائش بن جایا کرتے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں اس آزمائش پر پورا نہ اُتر سکی۔

تحریم کو دیکھتے ہی میں اُس پر مر مٹی' اس کا اپنا اسیر بنانے کے لیے فراخ دلی دے اپنے حسن اور پیار کی دولت اس پر لٹانے لگی تھی۔ بڑی قاتلانہ ادا سے سپردگی دیتی تھی۔ اس طرح کہ سیرابی کا سامان بھی ہو جاتا اور کشش بڑھانے کو کنارے پر لا کر جام کھینچ لینے سے اسے اپنے مکمل حصول کے لیے بے قرار و بے تاب بھی بنا دیتی تھی۔ تبھی تو وہ میرے لیے گھر والوں سے لڑ پڑا اور دربدر کی خاک چھاننے لگا۔ مجھے قسمت نے دوبارہ اُس سے ملا دیا ہے مگر اب کے وہ مجھ سے گم ہو گیا ہے۔

وہ میرے سامنے ہے مگر وہ ''تحریم'' نہیں رہا ہے۔

یا پھر یہ کہ میری کشش کا سحر ختم ہوگیا ہے۔اب میری آنکھوں ہونٹوں اور جوبن کا جادو اُس پر کام نہیں کرتا۔وہ نگاہ اُٹھا کر دیکھتا تک نہیں ہے۔اس رجسٹر کو پڑھنے سے پہلے اُس کے پلٹ آنے کی کچھ آس تھی مگر اب تو توقع کا ہر چراغ بجھ سا گیا ہے۔

کتنے عرصے سے میں اسے بے چین اِدھر اُدھر پھرتے' کسی تصور میں گم ہوتے' شدت کرب سے کروٹیں بدلتے اور ندامتوں کے حصار میں گھر کر ہونٹ چباتے دیکھتی رہی ہوں۔

تنزیلہ اکرام کے ''خاموش انتقام'' نے تحریم کو ریزہ ریزہ کر ڈالا ہے کہ وہ دن رات اپنی ہوس کی دہکائی ہوئی آگ میں جلتا رہتا ہے۔پشیمانیاں اسے جینے نہیں دیتیں۔

مگر۔

کیا یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا۔کوئی ''توڑ'' تو ہوگا تنزیلہ اکرام کے سحر کا۔''

اچانک جیسے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

رجسٹر میں تنزیلہ کے گھر کا ایڈریس درج تھا۔

اگر میں اُس سے ملوں؟ اُس سے تحریم کی سفارش کروں؟ اُسے مجبور کروں کہ وہ ''میرا تحریم'' مجھے واپس لوٹا دے۔اُسے سچے دل سے معاف کر کے؟۔

ہاں۔یہی واحد حل ہے ورنہ میں تا عمر تحریم کو نہ پاسکوں گی۔وہ کبھی مجھ تک طلب کی پیاس لے کر نہیں آئے گا۔

اسلام آباد میں ڈیڈی کے ایک بہت گہرے دوست رہتے تھے'اُن سے ہمارے فیملی ٹرمز رہے تھے۔اسلام آباد پہنچ کر تنزیلہ اکرام کا ایڈریس ڈھونڈنا ایسا دشوار بھی نہیں تھا۔

میں نے اگلے دن تحریم سے اسلام آباد کی فلائٹ کے لیے ٹکٹ لانے کی درخواست کی۔

''مجھے جمیلہ آنٹی نے کل فون کر کے اپنی بیماری کی اطلاع دی تھی۔اُن کی کوئی اولاد نہیں ہے۔مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں اگر آپ اجازت دیں تو ایک دو روز کے لیے اُن کے ہاں چلی جاؤں!''

بہانہ بنائے بنا چارہ نہیں تھا۔تحریم نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

♥♥♥

''کیا۔تنزیلہ اکرام یہیں رہتی ہیں؟'' بیل بجانے پر ایک بارعب چہرے والی بوڑھی خاتون باہر آئی تھیں۔

''جی ہاں مگر اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔''

خاتون نپی تلی نگاہوں سے میرا سراپا جانچ رہی تھیں۔انداز کی جھجک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ تنزیلہ کے ہاں بہت کم ملاقاتی آتے ہوں گے۔

''بہتر۔یہ بتا سکتی ہیں۔کب تک واپس لوٹیں گی؟'' میں نے شرافت سے مڑنے سے پہلے استفسار کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' خاتون ہچکچائی۔''ہوسکتا ہے'دو چار دنوں میں آجائے۔یا زیادہ دیر بھی لگ سکتی ہے۔میاں بیوی ہنی مون ٹرپ پر شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے گئے ہیں۔'' بوڑھی خاتون کے چہرے پر مسرت کے رنگ چمکنے لگے تھے۔میں ہکا بکا رہ گئی۔''ہنی مون۔تو۔تو۔اس کا مطلب ہے۔''

''اُن کی شادی کب ہوئی؟'' میری آواز میں لرزش سی در آئی۔بڑی بے صبری سے خاتون کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

''ابھی کوئی دو ہفتے پہلے ہوئی ہے او ہنی مون سے واپسی پر جرمنی جانے کا پروگرام ہے۔وہیں رہیں گی۔خیر سے اظہار بیٹے کی نوکری جو ہوئی۔''

مجھے یوں محسوس ہوا' جیسے میں عالم خواب میں یہ سب کچھ سن رہی ہوں۔یقین نہیں آرہا تھا اس معجزے پر۔

اور یہ یقین حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ایک ہفتے بعد میں [illegible]

اکرام کے گھر ڈرائنگ روم میں اُس کے مقابل کھڑی غور سے اُس کا ایک ایک نقش دیکھ رہی تھی۔

آخر کچھ تو ہوگا جس نے تحریم جیسے نفس پرست شخص کو اس درجہ ''متقی'' بنا دیا تھا۔

بظاہر دیکھنے میں وہ بڑی سادہ سی عام سی لڑکی تھی۔ نقش دیکھ رہی تھی۔

آخر کچھ تو ہوگا جس نے تحریم جیسے نفس پرست شخص کو اس درجہ ''متقی'' بنا دیا تھا۔

بظاہر دیکھنے میں وہ بڑی سادہ سی عام سی لڑکی تھی۔ نقش و نگار سراپا قد و قامت۔ سب کچھ نارمل تھا۔

ہاں مگر اس چہرے پر پھیلا حد درجہ سکون قابل توجہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں قائل کر لینے والی چمک تھی اور اس کے تیوروں میں عجیب جرأت آمیز مرعوب کن بے نیازی جھلکتی تھی۔ کچھ تھا ضرور کہ بندہ خود بخود اس کا لحاظ کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

''میں مسز تنزیلہ تحریم اختر ہوں۔'' میں اس کے چہرے پر پھیلتے ناگوار رنگوں کو دیکھ سکتی تھی۔ ''مگر آپ اطمینان رکھیے۔ میں صرف تعارف کروانے کے لیے کہہ رہی ہوں ورنہ میں اس کے حوالے سے آپ کے پاس نہیں آئی۔ مجھے میرا مسئلہ یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔ مجھے میرا شوہر واپس کر دیجیے تنزیلہ۔''

میں صوفہ چھوڑ کر تیزی سے اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کے دوزانو پر ہاتھ رکھ کر بولی اور پھر میں نے بلا کم و کاست تحریم کی حب آنکھوں دیکھی اور ''لکھی ہوئی'' ذہنی و جذباتی کیفیات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔

''وہ شروع سے ہی انتہا پسند اور جذباتی رہا ہے۔ جب نفس کا شکار ہو کر ٹیڑھی راہوں پر گامزن ہوا تو آگے بڑھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ مقدس رشتوں کا پاس بھی نہ کیا اور اب ''پرہیزگاری'' پہ آیا ہے تو بیوی کو بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔''

میں اُمید و بیم میں گھری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تنزیلہ اکرام کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ ہرگز بھی قابل معافی نہیں ہے تنزیلہ۔'' اُس نے تھکے تھکے انداز میں صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ''ہوس کار بندے کا کوئی دین ایمان نہیں ہوا کرتا۔''

''مگر اب وہ بہت بدل گیا ہے۔'' میں ملتجی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ''آپ سے تو اب ہماری رشتے داری بھی نکلتی ہے تنزیلہ۔ پلیز کچھ سوچیے۔''

گو کہ رشتوں سے انکار کے بعد اکبر تایا کی فیملی سے تعلقات مکمل طور پر منقطع ہو چکے تھے۔ ماہرہ اور طاہرہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ انتصار بھی ایک انگریز میم بیاہ لائے تھے اور اظہار رہ گیا تھا سو وہ بھی نپٹ گیا تھا۔ اچھے تعلقات رہے ہوتے تو یہ خبر بہت پہلے ہم تک پہنچ جاتی مجھے تجسس سا تھا کہ یہ کیونکر ہوا۔ تنزیلہ کس طرح راضی ہوئی۔

''اظہار سات برس بعد وطن واپس لوٹا تھا۔ ملاقات ہوئی تو پتا چلا' دونوں ابھی تنہا ہیں۔ اظہار نے کہا کہ سب لوگ اپنی اپنی زندگی میں سیٹل ہیں مگر ہم دونوں اکیلے ہیں اور وقت نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ تا عمر بھی دوری حائل رہے تو بھی دونوں ایک دوسرے کی کشش سے رہائی پا کر کسی اور کے نہ ہو سکیں گے۔ تو پھر اس طرح تنہا جینے سے بہتر ہے' مل کے زندگی کا سفر طے کر لیں۔ اندیشوں اور خدشات سے شکست کھا کر جینے کے کیا حاصل۔ یوں بھی اب وقت بہت آگے چلا گیا ہے۔ انتصار بھائی کی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ شادی کر کے بیوی کی اداؤں کے جال میں پھنسے بیٹھے ہیں پھر ہم نے کون سا یہاں رہنا ہے۔ میں جرمنی میں اپنا ذاتی گھر بنا چکا ہوں۔ ہم اپنی الگ جنت بسائیں گے' ہر سازش سے دور رہ کر اور میں بھی تنہا چل چل کر تھک چکی تھی۔ سو نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔''

تنزیلہ اکرام نے پُراعتماد انداز میں تفصیل بتائی تھی

''میں یہ نہیں کہتی کہ کہ آپ پرانے انداز میں لوٹ آئیں کہ کھوئی ہوئی بے ساختگیاں واقعی واپس نہیں لوٹا کرتیں مگر آپ اتنا تو کر سکتی ہیں کہ اپنے دل اُس کی نفرت ختم کر دیں۔ اُسے سچے دل سے معاف کر دیں۔''

میں لجاجت پر اُتر آئی تھی۔

''اس سے کیا ہوگا''؟ وہ پژمردگی سے میری اصرار کرتی آنکھوں میں جھانک کر سوال کر رہی تھی۔

''تحریم کے بے چین دل کو قرار آ جائے گا۔ اُس کی ہستی کی تکریم اس کی اپنی نظروں میں بحال ہو جائے گی۔ وہ ضمیر کی عدالت سے بری ہو جائے گا۔''

''اچھا۔'' وہ شاید اس بحث سے اُلجھ سی گئی تھی۔ ''اگر تمہاری تسلی اس طرح ہو سکتی ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اُسے معاف کر دیتی ہوں۔''

"اس طرح نہیں تنزیلہ۔ ایسے بات نہیں بنے گی۔" میری اضطراری کیفیت ہنوز برقرار تھی۔

"آپ خود اپنی زبان سے اُس کے روبرو اس سے ایک بار کہہ دیں۔"

میری فرمائش سنتے ہی اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور پیشانی پر غیظ کی لکیریں نمودار ہونے لگیں پھر کچھ دیر بعد خود پر قابو پا کر سرد لہجے میں گویا ہوئی۔

"یہ غضب نہ کرنا۔ وہ سامنے پڑا تو میرا ضبط چیخ جائے گا۔ مجھے خود پر قابو پانے میں بہت دشواری ہو جائے گی۔ بڑی مشکل سے میں خود کو منا پائی ہوں کہ نیکی کرتے رہنے چاہیے۔ ہر قسم کے صلے سے بے نیاز ہو کر۔ اپسے دیکھ کر میں "انسان" کے درجے سے گر کر ایک عام بندی بن جاؤں گی۔ جو آنکھ کے بدلے آنکھ' کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان کے اصولوں کو مدِنظر رکھتا ہے۔ درگزر اور مہربانی سے کام لے کر انسانیت کے درجے پر پہنچنے کی خواہش نہیں رکھتا۔"

اس کے لہجے میں عجیب سی سرسراہٹ تھی۔ میں تا دیر لب بستہ بیٹھی رہی پھر نئے سرے سے اُسے قائل کرنے پر کمر باندھ لی۔ بالآخر اُس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"گو کہ میں اب دوبارہ اس شخص کو اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر اپنے مقابل نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ تمہارا گھر بچانے کے لیے آخری بار اُس سے روبرو مل کر اُس کی اور تمہاری مشکل آسان کرنے کو تیار ہوں۔ پرسوں شام ہماری جرمنی کی فلائٹ ہے۔ غالباً اظہار بھی اپنے فرسٹ کزن سے سرپرائز ملاپ پر بہت خوش ہوں گے کیونکہ اظہار کی امی کی ڈیتھ کے بعد اب اُن کا پاکستان واپس آنے کا جواز نہیں رہا۔"

♥♥♥

اسلام آباد ائیرپورٹ کی جگمگاتی روشنیاں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔

گو ابھی شام نہیں ڈھلی تھی' سورج غروب ہونے میں کچھ وقت تھا مگر ائیرپورٹ پر تمام لائٹس آن تھیں۔

لاؤنج میں بھاگتے پھرتے لوگوں کے درمیان بالآخر وہ دونوں مجھے نظر آ گئے۔ وہ ادھر ہی آ رہے تھے۔ میں مضطربانہ کھڑا ہو گیا۔

میرا دل اس قدر شدت سے دھڑکا' جیسے ابھی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ کتنا جاں گسل لمحہ تھا یہ۔ وہ جس کی یاد میں پہروں جاگتا تھا' یوں مقابل آئی تھی تو پوری کوشش کے باوجود پلکیں اُس کی طرف اُٹھ کے نہیں دے رہی تھیں۔ میرا سر اور نگاہ دونوں جھک گئے تھے۔

ابھی کل رات ہی تو تنزیلہ نے فون پر ساری صورت حال واضح کرتے ہوئے فوری اسلام آباد آنے کے لیے کہا تھا۔

اُس کی شادی کی خبر نے مجھے عجیب طریقے سے منجمد سا کر ڈالا تھا۔

یوں تو کہنے کو نہیں کوئی بھی رشتہ تجھ سے
جتنی اُمیدیں ہیں وابستہ ہیں تنہا تجھ سے
یہ الگ بات تجھے ٹوٹ کے چاہا لیکن
دل بے مایہ نے کچھ بھی نہیں چاہا تجھ سے

میں اتنا خوش نصیب تھا کہ اپنی پھٹی ہوئی جھولی میں چاند ستارے بھر لیتا۔ یہ نارسائی تو اب ہمیشہ کے لیے اپنا مقدر بن گئی تھی۔

مگر اب میں بہت سنبھل چکا تھا۔ اس خبر نے مجھے جذباتیت کی انتہا پر نہیں پہنچایا۔

"چلو اچھا ہوا۔ اس نے بھی خوشیوں کا منہ دیکھا۔ اپنا کیا ہے' جی تو رہے ہیں۔" میں نے دل بڑا کر کے اظہار بھائی سے گلے ملنے کے بعد اس سے سلام دعا کی۔

تنزیلہ نے سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

پھر ایک خاموشی سی حائل ہوگئی۔

اظہار بھائی بڑی گرمجوشی سے ملے تھے۔ سب کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ تنزیلہ سے تو علیک سلیک ہو چکی تھی' اُن کی۔

اظہار بھائی کی کام کے سلسلے میں کاؤنٹر کی طرف گئے تو اُسی لمحے وہ اُٹھ کر عین میرے مقابل آ گئی۔

میرا دل بے تحاشا دھڑک اُٹھا۔ نظریں بدستور جھکی رہیں۔

"میں گزرے وقت کو دہرانا وقت کا زیاں سمجھتی ہوں۔" بالآخر وہ بہت دھیمے مگر پرسکون مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔

"جو کچھ ہوا' میں اُسے بھولنے کی کوشش کروں گی۔" اس کی گہری سانس لی۔

"میں تم سے ہی کیا کسی سے بھی زیادہ دیر تک نفرت نہیں رکھ سکتی کہ یہ میری فطرت ہی نہیں ہے مگر یہ بھی طے ہے کہ جب جب بھی ہم ملے' بیتے واقعات کسی نہ کسی روپ میں آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں گے۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ آئندہ ہمارا آمنا سامنا نہ ہو۔ میں تم سے نفرت نہیں کرتی مگر اب تم سے کسی قسم کا رابطہ اور تعلق استوار کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ تم اگر اپنے سابقہ رویوں کا مداوا کرنا چاہتے ہو تو پھر تنزیلہ رحمٰن کو حقیقی معنوں میں زندگی کا حصہ بنالو اور شاید یہی تمہارا کفارہ بھی ہے۔" وہ بے تاثر لہجے میں رکے بغیر سر جھٹک کر کہہ رہی تھی پھر اچانک میں اُس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔

اگر تم سچے دل سے تائب ہونا چاہتے ہو تو پھر
تم کو احساس ندامت ہے تو اتنا کرنا

پھر کسی شخص کو اس طرح نہ تنہا کرنا

اپنے آپ سے' اپنے جذبات سے اور اپنے معاملات کے ہر پہلو میں ایمانداری' خلوص اور سچائی سے کام لو' یہی سکون دل کی کنجی بھی ہے۔ خدا حافظ۔"

اظہار بھائی کے واپس لوٹنے پر وہ الوداع کہہ کر شوہر کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

اظہار بھائی نے آخری دفعہ گلے سے لگا کر پیار کیا اور پھر دونوں میاں بیوی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں یونہی کھڑا تکتا رہ گیا۔

"آیئے چلیں۔" تنزیلہ رحمٰن نے میرے کندھے پر دباؤ ڈال کر آہستگی سے میرا رخ موڑا تو میں چونک سا گیا۔

پھر ہارے ہوئے شکستہ قدموں سے ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکل آیا۔

"کیا خیال ہے۔ کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے ہیں۔ ٹائم بھی ہونے والا ہے۔" واپسی کے سفر پر تنزیلہ رحمٰن کے لہجے میں بڑی بشاشت در آئی تھی۔

"مرضی ہے تمہاری' میں نے آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔

ڈنر کے دوران وہ مجھ سے بے تحاشا بولتی رہی' ہنستی مسکراتی رہی۔ مجھے بولنے' اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ترغیب دیتی رہی۔

اور اب ہم اسلام آباد سے لاہور واپس جا رہے ہیں۔

میری نگاہ میں ماضی کا اک اک لمحہ گردش کر رہا ہے۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں سیٹ پر بیٹھی تنزیلہ نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر لگاوٹ سے دیکھا۔

کچھ بھی نہیں ڈیئر۔" ایک گہرا سانس لے کر میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپاتا ہوں۔ گویا "کفارے" کی ابتدا کر دی ہے۔

اب جب جب بھی تنزیلہ اکرام کی یاد آئے گی' اُس کا تصور بے چین کرے گا' اسی طرح

تنزیلہ رحمٰن کی طرف لوٹ جایا کروں گا' اس کی گداز قربتوں میں سکونِ دل ڈھونڈوں گا۔ اُس پر محبت کے ستارے نچھاور کروں گا۔

جب دل تنزیلہ اکرام کو پکارنا چاہے گا تو ہونٹ تنزیلہ رحمٰن کا نام لینے لگیں گے۔

میں تنزیلہ رحمٰن کو عمر بھر چاہوں گا مگر

کیا میں تنزیلہ اکرام کے سحر سے نکل پاؤں گا؟ کیا اُسے بھلانے میں کامیاب ہو سکوں گا؟

کیا زندگی کے کسی اسٹیج پر تنزیلہ رحمٰن کی کشش تنزیلہ اکرام کی یادوں پر حاوی ہو سکے گی؟

کیا تنزیلہ رحمٰن وہ ''ساحر'' بن سکے گی جس کے طلسم میں قید ہو کر تنزیلہ اکرام کے سحر کا ''توڑ'' ہو سکے؟

اِن سوالوں کا جواب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس پوری کہانی میں دراصل میرا ''ساحر'' کون تھا۔